فہرست مضامین

(۲)

(از جناب مولوی محمود شیرانی صاحب)

فرخی

شعر العجم میں فرخی کے باپ کا نام "قلوغ" (ص۳۷) دیا گیا ہے حالانکہ چہار مقالہ اور لباب میں صاف جولوغ مرقوم ہے۔ شاعر کے حالات شبلی نے جیسا کہ ص ۳۷ کے ایک حاشیہ میں کہا گیا ہے چہار مقالہ نظامی عروضی سے لیے ہیں۔ فرماتے ہیں "گویا میں نے اسی کا لفظی ترجمہ کیا ہے" اگرچہ وہ لفظی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بعض مقامات پر تصرفات بھی کیے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

"ابو المظفر چغانی اس زمانہ میں سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا اور نہایت فیاض طبع اور قدر دان سخن تھا۔" شعر العجم

چہار مقالہ میں ابو المظفر چغانی کا البتہ ذکر ہے لیکن یہ خیال کہ وہ اُن ایام میں سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا کہیں ظاہر نہیں کیا گیا نہ چہار مقالہ میں ایسے الفاظ ہیں جن کا مفہوم یہ عبارت ہو سکے۔ ابو المظفر چغانی کا سلطان کی طرف سے گورنر بلخ مقرر کیا جانا ایک غلط بیان ہے دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں بیان کیا ہے :-

"فرخی مادح امیر کبیر ابو المظفر بن امیر نصر بن ناصر الدین ست کہ در روزگار سلطان محمود سبکتگین والی بلخ بود"

(تذکرۂ دولت شاہ مطبوعۂ یورپ ص ۵۵)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے ابو المظفر چغانی والیِ چغانیان اور ابو المظفر نصر برادر سلطان محمود کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے۔ چغانیہ ماوراءالنہر میں ایک ولایت کا نام ہے اور فرخی کے ممدوح کا نام ابو المظفر بن احمد محمد والی چغانیاں ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے ؎

تا نقش کرد بر سر ہر نقش بر نوشت ۔۔۔ مدح ابو المظفر شاہِ جہانیاں

بن احمد محمد شاہِ جہاں پناہ ۔۔۔ آں شہریار کشور گیر و کشورستاں

تاریخ یمینی میں اس کو ابو المظفر محمد بن احمد لکھا گیا ہے فرخی غالباً بضرورتِ شعر اس کا نام ولدیت کے بعد لایا ہے۔ چغانی خاندان چغانیہ میں امیر نصر ۳۳۱ھ سے حکمراں رہا ہے، سامانیوں کے دور میں سامانیوں کا برائے نام مطیع تھا، غزنویوں کے عہد میں یہ خاندان برقرار اور برسرِ حکومت رہا ہے، آل غزنہ سے ان کے اچھے مراسم تھے، چنانچہ ابو القاسم والیِ چغانیاں سلطان مسعود غزنوی کا داماد تھا جیسا کہ بیہقی (ص ۶۱۴) سے معلوم ہوتا ہے۔ فرخی اپنے ممدوح ابو المظفر کا ذکر ایک آزاد اور مطلق العنان فرماں روا کی حیثیت سے کرتا ہے جس کو کبھی خسرو کبھی شہریار اور کبھی بادشاہ کے القاب سے یاد کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ بلخ کے گورنر کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال ہرگز ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ قولہ

"فرخی کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا اور اب اس نے اس فن میں کافی ترقی کر لی تھی، شاعری کی قدردانی کے قصے ہر جگہ مشہور تھے اس لئے اس کو خیال ہوا کہ اس ذریعے سے یہ مشکل حل ہو گی"

یہ عبارت نظامی عروضی کے چہار مقالہ میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ قولہ

"فرخی ہر طرف پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا تھک کر چور ہو گیا اور وہیں زمین پر پڑ کر سو رہا۔ صبح دن چڑھے اٹھا"

(شعر العجم ص ۶)

فقراتِ بالا کے درمیان نظامی کے ہاں یہ عبارت ہے۔ "آخر الامر رباطی ویران بر کنارِ لشکر گاہ پدید آمد کرگاں در آں رباط شدند، فرخی بغایت ماندہ شدہ بود در دہلیز رباط دستار زیرِ سر نہاد و حالی در خواب شد از غایتِ مستی و ماندگی۔ کرگاں را شمردند چہل و دو سر بودند، رفتند و احوال با امیر بگفتند، امیر بسیار بخندید و شگفتیا نمود و گفت مردے مقبل ست کار او بالا گیرد، او را و کرگاں را نگاہ دارید و چوں و بیدار شود مرا بیدار کنید مثال پادشاہ را امتثال کردند۔

دیگر روز بطلوع آفتاب فرخی برخاست" (چہار مقالہ ص۴۰)

باوجود ایسے اختلافات کے جن کی کچھ مثالیں اوپر گزری ہیں مولانا مدعی ہیں کہ میں نے چہار مقالہ کا لفظی ترجمہ کیا ہے تو ل

"ایاز جو سلطان محمود کا محبوب خاص تھا، فرخی کا نہایت قدر دان تھا، اور اس سے نہایت خلوص رکھتا تھا۔ ربط زیادہ بڑھا تو محمود کو رشک ہوا یہاں تک کہ فرخی کا دربار بند کر دیا، فرخی نے متعدد قصیدے معذرت میں لکھے، بالآخر سلطان صاف ہو گیا اور فرخی بدستور دربار میں جانے لگا" (شعر العجم ص۸۰)

یہاں شبلی نے مجمع الفصحا کی روایت کو فروغ دے کر فرخی کو سلطان کا رقیب بنایا ہے اگر مولانا قصائد فرخی کو ذرا زحمت گوارا فرما کر غور سے مطالعہ فرماتے تو اُن کو علم ہو جاتا کہ یہ روایت بالکل لغو اور بے سر و پا ہے۔ فرخی کے قصائد سے ثابت ہے کہ سلطان محمود فرخی سے کسی وقت ناراض نہیں ہوا اور نہ اس نے معذرت میں کوئی قصیدہ لکھا، نہ لباب الالباب و رچہار مقالہ میں فرخی اور ایاز کی محبت کا قصہ آتا ہے۔ مجمع الفصحا میں اور بھی مزخرفات بھرے ہیں، لیکن ہمیں کیا ضرور ہے کہ تحقیق اور تنقید کے فرایض کو بالائے طاق رکھ کر اور دروغ برگردنِ راوی کہکر صرف نقالی پر اتر آئیں۔ نقل راعقل بایستی یہ کام تو ہر شخص کرسکتا ہے لیکن نقال اور ہے اور محقق اور قالہ

"اس زمانہ کے تمدن اور معاشرت پر تعجب ہوتا ہے کہ شعرا محمود کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے اس میں علانیہ ایاز کے حسن و معشوقی کا ذکر کرتے تھے اور محمود اس سے خوش ہوتا تھا، فرخی ایک قصیدہ میں لکھتا ہے ؎

امیر جنگجو ایاز اُدیماق | دل و بازوی خسرو روز پیکار
زنانِ پارسا از شوق گردند | بہ کابین کردنی او را خریدار
نہ بر خیرہ بود دل او محمود | دلِ محمود را بازی مپندار
جُز او در پیشِ سلطاں نیز کس بود | جز او سلطاں غلاماں داشت بسیار
اگر چوں میر یک تن بود آں جا | نہ چندیں بد مرا در اگرم بازار

(شعر العجم ص۸۰)

یہ نکتہ شبلیانہ ندرت آفرینی کے مثال ہے اس معاملۂ خاص میں مولانا مجمع الفصحا وغیرہ کے رہین منت نہیں ہیں بلکہ اپنی ذاتی اجتہاد کے۔ علانیہ ایاز کی حسن و معشوقی کا ذکر تو کجا محمود ایسا جابر بادشاہ تھا کہ اپنے غلاموں کی طرف کسی کے پوری

نگا[illegible] کر دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا ابوالفضل بیہقی نے اس قسم کا ایک واقعہ اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

ایک روز سلطان کے ہاں باغ فیروزی میں مجلس شراب تھی، امیر یوسف برادر محمود بھی موجود تھا۔ شراب کا دَور چل رہا تھا۔ غلام دو دو مل کر نوبت بہ نوبت ساقی گری کر رہے تھے۔ ان میں طغرل کی باری بھی آئی۔ طغرل اس روز قبائے سُرخ پہنے تھا۔ امیر یوسف پر شراب کا پورا اثر ہو چکا تھا۔ یوسف کی جب طغرل پر نظر پڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے محویت کے عالم میں دیکھتا رہا۔ سلطان کو بھائی کی یہ حرکت ناگوار ہوئی اور کہنے لگا کہ باوا جان نے مرتے وقت عبداللہ دبیر کے معرفت پیغام بھیجا تھا۔ میں بیہقی کے الفاظ نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں :-

"محمود را از پیغام من بگوے کہ مرا دل بہ یوسف مشغول ست و برائے تو سپردم باید کہ وے را بجوی خویش بر آری وچوں فرزندانِ خویش عزیز داری۔ و ما را ایں غایت دانی کہ براستاے تو چند نیکوئی فرمودہ ایم و پنداشتیم کہ با ادب بر آمدہ و نیستی چناں کہ ما پنداشتیم۔ در مجلس شراب رغلامانِ ما چرا نگاہ می کنی و ترا خوش آید کہ ہیچ کس در مجلس شراب در غلاماں تو نگرد و چشمت از دیر باز بریں طغرل ماندہ است و اگر حرمت روانِ پدرم نبودی ترا مالشے سخت تمام رسیدے۔ ایں یک بار عفو کردم و ایں غلام را بہ تو بخشیدم کہ ما را چنو بسیار ست، ہوشیار باش تا بار دیگر چنو سہو نیفتد کہ با محمود چنیں بازیہا نرود۔ یوسف متحیّر گشت و بر پائے خاست و زمین بوسہ داد و گفت توبہ کردم و نیز چنیں خطا نیفتد امیر گفت بنشیں بنشست و آں حدیث فرا بریدہ" (بیہقی ص ۳۰۶)

اس سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ شعرا کے لیے محمود کے مدحیہ قصائد میں ایاز کی حُسن و معشوقی کا ذکر قریب قریب ناگوار تھا۔ فرخی کے جو اشعار اُنھوں نے اپنی استدلال میں لکھے ہیں اس سے میں اندازہ کرتا ہوں کہ دیوانِ فرخی اُن کی نظر سے نہیں گزرا، کیونکہ یہ قصیدہ محمود کی مدح میں نہیں ہے بلکہ خود ایاز کی تعریف میں اور اُس وقت لکھا گیا ہے جب کہ محمود دنیا سے انتقال کر چکا ہے اور سلطان مسعود اپنی تخت نشینی کے بعد ایاز کو اس کے حُسنِ خدمات کے صلہ میں جن کی تفصیل بھی اسی قصیدہ میں درج ہے ایک گراں بہا انعام دیتا ہے۔ قصیدہ کا مطلع ہے ؎

غمِ نادیدنِ آں ماہِ دیدار مرا در خوابگہ ریزد ہمی خوار

اور گریز کے وقت شاعر گویا ہے ؎

ز دل بر داشت خواہم بار اندہ چو نزد میر سید یافتم بار

امیر جنگجو ایاز ادیماق	دل و بازوے خسرو روز پیکار

اِس کے بعد شاعر سلطان مسعود بن محمود کی فیاضی ایاز کی خدمت کے صلہ میں یوں بیان کرتا ہی ؎

خداوند جہاں مسعود محمود	کہ اورا زرہمی بخشد بخروار
جزاو را ازہمہ میراں کرادا	بیک بخشش چہل خروار دینار
نہ دادندش چنیں بیہدہ زر	بہ چندین و بصد چندیں سزاوار
بجائے قدر میر و حشمت شاہ	تو ایں اخوار دار و اندک انگار
بجائے برد خواہد خسرو اورا	کہ سالاراں بدو گردند سالار
بدو بخشد چو مال خطۂ بست	خراجِ خطۂ مکران و قصدار
کجا گردد فراموش آنچہ او کرد	زبہرِ خدمتِ شاہِ جہاندار
میانِ لشکرِ عاصی نگہ داشت	وفا و عہد آں خورشید احرار
برو زر روشن از غزنین برو رفت	ہمی زد با جہانے تا شبِ تار
نماز شام را چنداں کہ خوانند	کہ دشت از کشتہا شد پشتہ ہموار
گروہے را ازاں شیرانِ جنگی	بکشت و باقی را داد زنہار
جز او ہرگز کہ کرد است ایں بگیتی	بخواں شہنامہ و تاریخ احرار
خدایا ناصرِ او باش از قدر	سرِ رایاتش از خورشید بگزار

فرخی کے حالات میں یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہی کہ سلطان محمود کے دربار میں اس کا تعلق کس زمانہ سے ہوتا ہی۔ اس غرض کے لیے سب سے صحیح اطلاع اس کے دیوان سے مل سکتی ہی۔ میں ناظرین کے معیت میں دیوان کا مطالعہ ذیل میں شروع کرتا ہوں۔ ضمناً بعض واقعاتِ تاریخ معاصر پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

فرخی کے ہاں اسمائے ذیل کی مدح میں قصائد ملتے ہیں۔

(۱) سلطان محمود غزنوی (۲) عضد الدولہ ابو یعقوب یوسف بن ناصر الدین سبکتگین برادر سلطان محمود۔
(۳) ابو احمد محمد بن سلطان محمود (۴) سلطان مسعود شہید بن سلطان محمود (۵) خواجۂ بزرگ شمس الکفاۃ احمد بن حسن میمندی

(۶) خواجۂ سید اسعد (۷) خواجۂ ابو الفتح علی بن الفضل (۸) خواجہ سید ابوبکر حصیری (۹) خواجہ منصور بن حسن (۱۱) ابو الفتح عبد الرزاق بن احمد (۱۲) عمید منصور ابو الحسن (۱۳) ایاز دیماق (۱۴) ابو بکر عبد اللہ بن یوسف (۱۵) خواجہ ابو سہیل دبیر (۱۶) خواجہ عمید سید ابو احمد غنی (۱۷) خواجہ سید بو سہل عراقی وکیل (۱۸) خواجۂ بو سہل رئیس الرؤسا احمد بن حسن (۱۹) خواجہ سید ابو سہل عمر کدخدائے عضد الدولہ (۲۰) فخر الدولہ ابو المظفر محمد بن احمد چغانی۔

اِس فہرست میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امیر نصر بن ناصر الدین سپہ سالار خراسان اور خواجہ ابو العباس فضل بن احمد اسفرائنی وزیر (۳۸۴ھ و ۴۰۱ھ) اوّل سلطان محمود، المتوفی ۴۲۱ھ کا نام داخل نہیں ان جلیل القدر اشخاص کے نام کی فرخی کے ممدوحین میں عدم شمولیت ایک قابلِ تعجب امر ہے۔ فہرست میں اکثر ایسے نام نظر آتے ہیں جو پانچویں قرن کے آغاز کے بعد محمود کے ہاں رسوخِ اقتدار اور شہرت حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً امیر یوسف، امیر محمد اور مسعود چوتھی صدی کے اختتام پر کسی شمار و قطار میں نہ تھے ۴۰۱ھ میں امیر یوسف سترہ سال کا تھا اور امیر محمد اور مسعود چودہ چودہ سال کے ۴۰۶ھ میں امیر محمد والی گوزگاناں اور امیر مسعود والیِ ہرات (بقولِ فرشتہ) بنائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شعرا اس سن کے بعد ان کی مدح سرائی کرنے لگے ہیں۔

قصائد فرخی کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر کا تعلق زیادہ تر امیر یوسف ابن ناصر الدین، امیر ابو احمد محمد اور خود سلطان محمود سے رہا ہے۔ لیکن اوّل الذکر امیر یوسف سے اُس کو خاص تعلق تھا بلکہ غزنین کی آمد پر سلطانی دربار میں رسائی حاصل کرنے سے قبل امیر یوسف کے دربار سے واسطہ پیدا کر لیا ہے۔ اِس وقت تک وہ بالکل گمنام اور اجنبی تھا چنانچہ فرخی ؎

چو تشنہ گشتہ و گم بودہ مردمی بودم | بطمع آب رواں گرم گاہ سوئے سراب
مرا تفضلِ تو آب داد و راہ نمود | بہ بوستانیِ خوشتر ز روزگارِ شباب

امیر یوسف کی فیاضیوں نے اسے جلد خوش حال کر دیا ہے۔ فرخی

شکرِ تو بر من فراواں واجب ست ای شہریار | از فراوانی نہ دانم گفت شکرت کیں کدام
چیست نیکو تر ز جاہ از تو رسیدستم بجاہ | چیست شیریں تر ز کام از تو رسیدستم بکام

ابھی مدح سرائی کا تعلق قایم بھی نہیں ہوا تھا کہ امیر نے غالباً اس کا ذکر سُنکر خلعت بھیجا ہے۔ فرخی

شاعراں را ملکاں خواستہ اگاہ بند   کہ بدیشاں ہمی آرند دیکی چو گہر

او مرا خلعت و دینار بوقتے فرمود   کہ مرا مدحت او گشتہ نبود اندر سر

اِس سے ظاہر ہی کہ امیر یوسف نے خواہش کر کے فرخی کو اپنی ہاں بلوایا ہی۔

امیر نے ایک مرتبہ بھیڑیا کمند سے پکڑا اس کے لیے فرخی کہتا ہی ؎

جز تو کے بست گرگ را بکمند   اے ترا میر گرگ گیر لقب

امیر یوسف اپنے اسراف کی وجہ سے تنگدست رہتا تھا اِس کے متعلق شاعر کہتا ہی ؎

مرا غم آید اگرچہ مرا دلے ست فراخ   زمان دادن و بخشیدن بداں کردار

چناں ملک را باید کہ باشدے ہر روز   خزانہ پُر درم و پُر سلیح و پُر دینار

چو خرچ خویش فزوں تر ہمی ز دخل کند   ز زرّ و سیم خزانہ تہی بود ناچار

ایک قصیدہ میں امیر کے حاجب طغرل کی کتخدائی کا ذکر آتا ہی جو امیر یوسف نے نہایت دھوم دھام سے کی تھی ؎

از پئے حاجب طغرل کہ ز شاہانِ جہاں   حاجبے نیست چنو، ہیچ کسے را دیگر

بہ پسند دل خویش او را درخواست زنی   ز تبارے کہ ستودہ است با صل و گہر

ہرچہ شایست بکرد واں چہ بایست بداد   کار او کرد تمام و عیش او برد بسر

آں چہ او کرد بتزویج یکے بندۂ خویش   نکند ہیچ شہے از پئے تزویج پسر

آں نہالے کہ دریں خدمت حاجب بنشاند   سر بعیوق بر آورد و بخندید ز بر

خدمت میر بدل کرد ہمی تا از دل   خدمت او کند امروز ہر آں کو برتر

خدمتش بود پسندیدہ بہ نزدیک امیر   لاجرم میر کلہ داد مر او را و کمر

طغرل حسین ہونے کے علاوہ ظرافت اور لیاقت میں بھی بے مثل تھا، ترکستان سے ارسلان خاتون نے سلطان محمود کے پاس ہدیہ میں بھیجا تھا، جیسا کہ گزشتہ سطور میں دیکھا گیا ہی سلطان نے امیر یوسف کو دے دیا۔ یوسف نے اپنے فرزندوں کی طرح اِس کی پرورش کی۔ جب جوان ہو گیا ایک نامی گھرانے میں اُس کی شادی کردی اِس عروسی کے متعلق بیہقی کہتا ہی۔ بڑی غیر ضروری تکلّف اور تیاریاں کی گئی تھیں جن کو سمجھدار لوگوں نے ناپسند کیا۔

فرخی کا دوسرا ممدوح امیر محمد ہے۔ امیر محمد معلوم ہوتا ہے اپنے خاندان میں سب سے زیادہ علم دوست اور قدردان علم تھا۔
فرخی کئی موقعوں پر اس قسم کی تلمیحیں کرتا ہے۔ چنانچہ ؎

قطب معانی ملک محمد محمود — ناصر علم و معین ملت و مختار
آں کہ ز دعوی فزوں نماید کار — واں کہ ز گفتار بیش دارد کار
جود و سخا را از و فزوں شدہ قدرت — علم و ادب را بدو فروختہ بازار
اہل ادب را بزرگ دارد و شگفت — این ز بزرگیش بس بزرگ مدار
قدر گوہر جز گوہر شناس نداند — اہل ادب را ادیب داند مقدار
چشم بداں دور باد زاں شہ کاں شہ — سخت ادب پرورست و علم خریدار

دیگر

پدر از ملک زمیں بیشتریں یافتہ بہر — پسر از کتب جہاں بیشتریں کردہ زبر

دیگر

چوں بپا بر سر زباں دارد — فقہ و تفسیر و مسند و اخبار

تیسرا شخص جس سے ہمارے شاعر کو دلچسپی رہی ہے، خود سلطان محمود ہے۔ فرخی کے ہاں محمود کی زندگی کے واقعات کے متعلق جو بیانات ملتے ہیں ان میں سب سے قدیم فتح قنوج و کالنجر ہے۔ دو قصیدوں میں حملۂ سومنات کا ذکر آتا ہے۔ دو قصیدوں میں مختصرًا فتح ری کا ذکر ہے جو محمود کے آخری دوران عمر کا کارنامہ ہے۔ مہم قنوج سے پیشتر کے کارناموں کا فرخی کے ہاں کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے واضح ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر سلطان کے دربار میں ۴۰۹ھ سے پیشتر جو مہم قنوج کا سال ہے آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سن کے واقعات اس کے ہاں ملتے ہیں اور قبل کے واقعات نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان کے بھائی امیر نصر اور وزیر سابق فضل بن احمد کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔ کیونکہ اس کے آنے سے قبل یہ دونوں جلیل المرتبہ اشخاص وفات پا چکے ہیں۔ فضل بن احمد ۴۰۳ھ میں ہلاک ہوتا ہے، امیر نصر کا سال وفات تاریخ میں مذکور نہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان کی وفات ۴۰۲ھ و ۴۰۸ھ کے درمیان میں کسی وقت واقع ہوئی ہے امیر نصر کے بعد امیر یوسف سپہ سالار خراسان بنایا جاتا ہے۔

فتح سومنات (۴۱۶ھ) جس میں غالباً فرخی بھی شامل تھا سلطان محمود کے نمایاں کارناموں میں سے ہے۔ شاعر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود کے دل میں دو آرزوئیں بے حد گدگدی لیتی رہی ہیں۔ پہلی زیارت خانہ کعبہ دوسری فتح سومنات ؎

خدایگاں را اندر جہان دو حاجت بود همیشه این دو همی خواست زایزد داور

یکے کہ جائے کہ حج ہندواں بکند دگر کہ حج کند و بوسہ برد بہ حجر

یکے ازاں دو مراد بزرگ حاصل کرد دگر بعون خدائے بزرگ کردہ شمر

ولہٗ

توفیق دہ او را و برتابکند حج چوں کرد بشادی و بہ پیروزیِ بازار

معلوم ہوتا ہے کہ سومنات نے سلطان کی توجہ کسی غیر تاریخی روایت کی بنا پر اپنی طرف اور بھی جذب کر لی تھی۔ وہ روایت یہ تھی کہ مکۂ معظمہ میں تین زبردست بت تھے عزیٰ، لات اور منات۔ عزیٰ اور لات رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں برباد کر دیئے گئے، لیکن منات کو کافر چرا کر ہندوستان لے آئے۔ سومنات اور منات کی ناموں میں اشتراک یاہم کی پیچیدہ دشواریوں نے اس روایت کو سلطان کے دربار میں معلوم ہوتا ہے بہت کچھ فروغ دیدیا ہے۔ اسی روایت کے زیر اثر صاحب طبقات ناصری سومنات کا نام منات ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ **فرخی**

ملک همی بہ تبہ کردن منات شتافت شتاب او ہمہ از بہرِ دیں بود اکثر
منات و لات و عزّائے در مکہ سہ بت بودند ز دست برد بت آرائے آن زماں آذر

ہمہ جہاں ہمی آں ہر سہ را پرستیدند جز آں کسے کہ برو بود از خدای نظر
دو زاں پیمبر بشکست و ہر دو را آنروز فگندہ بود ستاں پیش کعبہ پاے سپر

منات را ازمیاں کافراں بہ زدیدند بکشور دگر انداختند ازاں کشور
بجایگاہے کز روزگار آدم باز بہ آں زمین نہ نشست و نہ رفت یک کافر

زبہرِ آں بت بتخانہ بنا کردند درآں خرابہ بہ صندوق ہای پیل گہر
بہ بتکدہ اندر بت را خزانہ کردند بعبد ہزار تماثیل و صد ہزار صور

گہر خریدند او را از شہرہا چنداں کہ سیر گشت ز گوہر فروش گوہر خر
برابر سر بت کلہ فرو ہشتند نگار کار بیاقوت و بافتہ بگہر

بدر زر یکے خود ساختند او را چو کوہ آتش و گوہر برو بجای شرر
بمال مملکتے تاج و افسرش بودہ است کمینہ چیزے آں تاج بود و آں افسر

پس آنگہ کردند آں را سومنات لقب لقب کہ دید کہ نام اندرو بود مضمر
خبر فگندند اندر جہاں کہ از دریا بتے برآمد زیں گونہ و بدیں پیکر

مدبرِ ہمہ خلق ست و کردگارِ جہاں ضیا دہندۂ شمس ست و نور بخشِ قمر
بعلم ایں بود اندر جہاں صلاح و فساد بحکم ایں بود اندر جہاں قضا و قدر

گروہِ دیگر گفتندے کہ ایں بت را بر آسمانِ بریں بود جایگاہ و مقر
کسے نیاورد ایں اندریں مقام کہ ایں ز آسمان بخواہش خود آمدست ایدر

بدیں بگوید و زد بدیں بگوید شب   بدیں بگوید بحر و بدیں بگوید بر
چو ایں زدنیا سر بر زدد بجنگ آمد   سجود کردند ایں را ہمہ نبات و شجر
بشیر خویش مر ایں را بشست گاؤ و کنوں   بدیں تقرب خوانند گاؤ را مادر
زبہر سنگی چندیں ہزار خلق خدای   بقول دیو فروہشتہ بر خطر لشکر
فریضہ بہر روز آں سنگ را بشستندے   بہ آب گنگ و بشیر و بزعفران و شکر
زبہر شستن آں بت زگنگ ہر روزے   دو جام آب رسیدے فزوں زدہ ساغر
ز آب گنگ چہ پیدا کہ چند فرسنگ ست   بسومنات بدآں جایگا زدہ است سر
خدائے خوانند آں سنگ را ہمی ایشاں   چہ بیہدہ سخن ست ایں کہ خاکِ شاں بسر
بر آں نیت کہ مر آں را ابکہ باز برند   بکند و اینک باما ہمی برد ہمسر

فرخی کے بیان سے ظاہر ہے کہ وہ سلطان کے بعض سفروں میں بھی ہمراہ رہا ہے

شنیدہ ام کہ ہمیشہ چناں بدی دریا   کہ بردو منزل از آواش گوش گردد کر
ہمی نماید نوبت ہمی نماید شور   ہمی برآید ہو جوشش برابر محور
سہ بار با تو بدریای بیکرانہ شدم   نہ موج دیدم و نے ہیبت و نہ شور نہ شر

سلطان محمود کی عادت تھی کہ جنگ کے وقت گھمسان کے معرکوں میں فوجوں کا دل بڑھانے کے لئے وہ خود سب سے آگے بڑھتا تھا۔ چنانچہ فرخی

من ملک محمود را دیدستم اندر روز جنگ   پیش لشکر خویشتن کردہ سپر ہنگام کار

فرخی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود کے قبضہ میں ہاتھیوں کی سب سے زائد تعداد اس کے آخر حیات میں سترہ سو پچاس تھی

بعرضگاہ تو لشکر چناں کہ باز نمود   ہزار و ہفصد و اند پیل بدشمار

دیگر

گفت آں ہزار و ہفصد و پنجاہ کوہ کیست   گفتم ہزار و ہفصد و پنجاہ پیل شاہ

کابل میں جب پندرہ شوال ۴۲۲ھ کو سلطان مسعود آیا ہے اور ہاتھیوں کا جائزہ لیا گیا ہے تو اس وقت سولہ سو ستر ہاتھی عمدہ حالت میں موجود تھے اس تعداد میں بیمار اور لاغر جانور شریک نہ تھے۔

فرخی کا اپنا بیان ہے کہ وہ سلطان محمود کے انعامات کی بدولت ایک امیرانہ اور آسودہ زندگی بسر کر رہا ہے وہ کہتا ہے۔

از فضل خداوند خداوندئے سلطاں   امروز من زدے بہ امسال من زپار

باضیعتِ آبادم و باخانۂ آباد   بانعمتِ بسیارم و باآلتِ بسیار

ہم باگلہ و اسپم و ہم بارمۂ میش   ہم باصنمِ چینیم و ہم بابتِ تاتار

ساز سفرم ہست و نوائے سفرم ہست   اسپانِ سبکپائے و دستورانِ گزین کار

از ساز مرا خیمہ چو بت خانۂ مانی   وز فرش مرا خانہ چو بت خانہ فرخار

میران و بزرگانِ جہاں احسد آید   زیں نعمت و زیں مال و زیں کار و زیں بار

محسود بزرگاں شدم از خدمت محمود   خدمتگرِ محمود چنیں باشد ہموار

سلطان مسعود کے عہد میں خواجہ بزرگ احمد بن حسن میمندی کو خطاب کرکے کہتا ہے ؎

من بندہ را کہ خدمتِ من بست سالہ است   از بہرِ خدمتِ تو پدید آمدہ یسار

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخی کو غزنین کے دربار سے تعلق پیدا کئے اس وقت تک تقریبًا بیس سال ہو چکے تھے خواجہ احمد حسن میمندی سنہ ۴۲۴ھ میں وفات پاتے ہیں اس حساب سے فرخی سنہ ۴۰۴ھ میں یا اس کے قریب زمانہ میں آیا ہے۔

خواجہ ابوبکر حصیری سے (فقیہہ) جو سلطان محمود کے ندیموں میں داخل اور امیر کبیر تھا، فرخی کو بوجہ ہم وطنی خاص رابطہ رہا ہے اس کے مدحیہ قصیدہ میں اپنی پچاس سالہ عمر کا بھی ذکر کرتا ہے ؎

خدمت او کن مخدوم شو و شاد بزی   من ازیں گونہ بگردیدم سالے پنجاہ

حصیری کا زیادہ عروج محمود کے اواخر ایام میں ہوا ہے، غالبًا یہ قصیدہ بھی اسی زمانہ کا ہے اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ فرخی سنہ ۳۷۰ھ سے کچھ پہلے پیدا ہوا تھا۔

منوچہری

اس سے قبل ایک مقام پر گزارش کیا جاچکا ہے کہ مولانا کے سنین و تاریخ غلط ہوتے ہیں اس قسم کی ایک تازہ مثال ذیل میں پیش ہے۔ شبلی فرماتے ہیں۔

"امیر منوچہر بن شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر جو مشہور رئیس اور جرجان کا فرماں روا تھا اور سنہ ۳۸۶ھ میں تخت نشین ہوا تھا یہ اس کے دربار میں ملازم تھا اس مناسبت سے منوچہری تخلص کیا تھا سنہ ۴۲۳ھ میں امیر منوچہر نے انتقال

کیا تو یہ غزنین میں آیا۔" (شعرالعجم ص ۱۸۶)

فلک المعالی امیر منوچہر ۴۰۳ھ میں تخت نشین ہوا ہے نہ ۳۸۶ھ میں اس کی وفات ۴۲۴ھ میں ہوئی ہے نہ ۴۱۱ھ میں۔ و ل

"تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس نے عنصری کی شاگردی بھی اختیار کی لیکن یہ بھی ایک خوشامد کا پہلو تھا جس طرح قلعہ میں لوگ بہادر شاہ سے گلستاں پڑھنے جایا کرتے تھے" (ص ۱۸۶ شعرالعجم)

یہاں تذکرہ نگار کیوں بدنام کئے جاتے ہیں عنصری کے استادی کا تو خود منوچہری کو اعتراف ہے جہاں وہ کہتا ہے ؎

کو جریر و کو فرزدق کو دلبد و کو لبید ... رو بہ و عجاج و دیک الجن و سیف ذی یزن

گو فراز آیند و شعر اُستادم بشنوند ... تا عزیزی روضہ بینند و طبیعی نسترن

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"بہرحال عنصری نے اس کو دربار شاہی میں پہونچایا اور سلطان محمد ابن سلطان محمود کے حضور میں ترخانی کا منصب ملا یعنی جب چاہتا دربار میں چلا جاتا کچھ روک ٹوک نہ تھی۔ محمد چند روز کی سلطنت کے بعد یعنی ۴۲۱ھ میں گرفتار ہو کر قید ہوا اور اس کے بھائی سلطان مسعود نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا۔" (شعرالعجم ص ۱۸۷)

اس کے بعد منصب ترخانی کا ذکر ہم غزنوی دور میں نہیں پڑھتے اور میرا خیال ہے کہ یہ عہدہ سلاطین مغول کے عہد میں رائج ہوا ہے۔ یہ ایک ترکی عہدہ ہے نہ ایرانی۔ منوچہری کا سلطان محمد ابن سلطان محمود سے کوئی تعلق نہیں رہا اس لیے اس کے دیوان میں اس کی مدح میں کوئی قصیدہ موجود نہیں اور نہ ان ایام میں منوچہری کے دربار غزنہ سے تعلقات قائم ہوئے تھے۔ فرماتے ہیں۔

"دولت شاہ نے اس کو بلخی لکھا ہے چونکہ نہایت دولت مند تھا اس لیے شصت گلہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔"

(شعرالعجم ص ۱۸۶)

قبلہ مولانا دولت شاہ کی سند پر منوچہری کو بلخی مان رہے ہیں لیکن اگر منوچہری کے اشعار پر جن کو خود مولانا بھی نقل کرتے ہیں ذرا لحاظ کر لیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ منوچہری نہیں ہے بلکہ دامغانی چنانچہ شعر

چنین تلخ عمرانیان ہم بدینسان ... بیامد منوچہری دامغانی

اِس کا لقب شصت گلہ نہیں تھا بلکہ کسی اور متاخر شاعر کا جس کا نام بقول پروفیسر براؤن (ص ۱۵۱ جلد دوم) شمس الدین احمد منوچہری ہے۔

منوچہری اپنا نسب سامانی شاہی خاندان سے بیان کرتا ہے:

منم از نژاد بزرگانِ ساماں　　　که بودند شاہانِ چتر و کواکب

فقیہ ہونے کے علاوہ منوچہری عربی صرف و نحو اور علم طب میں بھی کامل تھا ؎

من بدانم علم دین و علم طب و علم نحو　　　تو نہ دانی دال و ذال و راو زاو سین و شین

عربی ادب میں اس کی مہارت غیر معمولی تھی، تاریخ عرب و تاریخ عجم سے خوب واقف تھا، نجوم و ہیئت اور موسیقی کا بھی عالم تھا۔ غیر معمولی حافظہ کا مالک ہونے کی وجہ سے شعرائے عرب کا کلام اس کے ورد زبان رہتا ہے، اس کی غیر معمولی علمیت فنی، ادبی اور تاریخی تلمیحات نے اِس کے دیوان کو مشکل اوراق بنا دیا ہے، بعض قصیدوں میں وہ لغات کا ابر بن کر گرجتا اور برستا ہے۔ تشبیب نگاری، مناظرِ قدرت، بہار، باغ، گل و ریاحین، مرغ و پرند، سفر، شام و صبح، برف وغیرہ کے بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ جس طرح کہ تشبیہات و استعارات میں جدتِ قدم قدم پر اس کے ہاں ملتی ہے اسی طرح صنائع بدائع، لفظی لطافتیں، نئی عروضی اوزان کے استعمال میں بھی اسے تقدم حاصل ہے۔ مبالغہ، تکلف اور تصنع اس کے ہاں سب سے پہلی مرتبہ دیکھے جاتے ہیں۔ منوچہری کو اس نئی صنفِ شاعری کا موجد کہنا چاہیئے جس کی ابتدا اور نشو و نما شمالِ مغربی ایران میں ہوئی اور جس نے قطران تبریزی خاقانی اور نظامی جیسے شعرا پیدا کیئے۔ تجنیس کی بدعت منوچہری نے غزل کے میدان میں بھی شروع کر دی تھی۔ لیکن شکر ہے کہ یہ رواج مقبول نہ ہوا۔ گھوڑے کے بیان میں منوچہری کو خاص شغف ہے جس طرح تشبیب کا وہ بادشاہ ہے اسی طرح مدح کے میدان میں اس کا سمندِ قلم اسپ لنگ بن جاتا ہے مدح نگاری کبھی اس کو راس نہ آئی وہ طبیعت کا تمام زور تشبیب پر صرف کر دیتا ہے اور اسی ایک بات نے اِس کے دیوان کو موجودہ مذاق میں زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔

۴۲۶ھ میں جب ساری اور آمل کی طرف سلطان مسعود بن محمود کا گزر ہوا ہے سلطان نے رے سے جہاں ان ایام میں منوچہری مقیم تھا خواہش کر کے بلایا ہے ؎

خواست از رے خسرو ایران مرا از شصت میل　　　خود ز تو ہرگز نیندیشید در چندیں سنیں

جب سُلطان اطراف سے غزنین کی طرف مراجعت کرتا ہی منوچہری بھی کچھ عرصہ کے بعد غزنین پہنچ جاتا ہی ؎

دانی کہ من مقیم بر درگہ شہنشہ — تا باز گشت سُلطان از لالہ زار ساری
وین دشتہا بریدم وین کوہہا پیادہ — دو پائے با جراحت و دیدہ گشتہ تاری
اُمید آں کہ روزے خواند ملک بہ پیشم — بختم شود مساعد و زم شود بہاری
اکنوں کہ شاہ شاہاں بندہ کرد رحمت — کوشی کہ رحمتِ شہ از بندہ رگزاری
خشم آیدت کہ خسرو بر من کند نکوئی — اے دیگ آبِ دریا از من دریغ داری

سُلطان مسعود کو اس کی طرز شاعری دل سے پسند تھی ؎

از بہرِ آں کہ شعرم شہ را بدل خوش آید — برخاست از تو غلغل برخاست از تو زاری
من شعر بیش گویم کاں شاہ را خوش آید — الفاظ ہائے نیکو ابیاتہائے جاری
گر تو بہر مدیحے چندیں طپید خواہی — نمار ناصبوری نمار بے قراری

مسعود نے بعض وقت خود اشعار کی فرمایش کی ہی۔ منوچہری ؎

درخواستی تو شعرم ایں آمدت نزادی — اینت کریم طبعی اینت بزرگواری
اضعاف حرفہائے کز شعر من شنیدی — نیکیت باد و رحمت شادیت و شادخواری

سُلطان مسعود کے دربار سے تعلق پیدا کرنے سے پیشتر منوچہری گرگاں، رے اور خانقین میں رہ چکا ہی ؎

مرمرا بار بدیں درگاہ شاہ ست آرزو — نز ری و گرگاں ہمی یاد آیدم نز خانقین

پھر مسعود کی شاہانہ فیاضیوں کی طرف تلمیح کرتا ہوا گویا ہی ؎

شاعرانرا دری و گرگانی در شرواں کہ دید — بدرۂ عدنی بہ پشت پیل آوردہ بزین
آنچہ ایں مہتر دہد روزے بہ یکتر شاعراں — معتصم ہرگز بعمر اندر نداد و مستعین

جس طرح آتش کی آمد نے لکھنؤ میں اسی طرح منوچہری کی آمد نے دربار غزنین میں ایک شور مچا دیا ہی۔ حسد جو تلامیذ الرحمٰن کا ازلی حصّہ ہی بہت جلد اپنا رنگ لایا اور منوچہری کے بہت حاسد کھڑے ہو گئے ان میں شرواں کی طرف کا کوئی شاعر ہی جس کا نام باوجود کوشش نہ معلوم ہو سکا منوچہری کے خلاف اس نے بہت کچھ حصّہ لیا۔

عام حاسدوں کی شکایت اگرچہ منوچہری کے کئی قصائد میں ملتی ہی لیکن وہ قصائد میں شاعر کا روئے سخن اِسی شروانی کی طرف ہی۔ جب کہ کہتا ہی ؎

سالِ ہا زیں با تو ما را چہ جدال و جنگ خاست ۔۔۔ سالِ امسالیں تو با ما در گرفتی جنگ و کیں

باش تا سالِ دگر نوبت کرا خواھد بدن ۔۔۔ تا کرامی بایدم زد بر سرِ دے پوستیں

من ترا از خویشتن در بابِ شعر و شاعری ۔۔۔ کمتریں شاعر شناسم ہذہ حق الیقیں

گر مرا فرمودہ بودے خسروِ بندہ نواز ۔۔۔ بہتر از دیوان شعرت پاسخے کردم متیں

میر فرمودت کہ او یک شعر او را کن جواب ۔۔۔ بود سالے و نکردی ننگ باشد بیش ازیں

لیکن اشعار ترا آں قدر و آں قیمت نہ بود ۔۔۔ کش بفرمودے جوابِ آں خسروِ شاعر گزیں

گر تو اے ناداں ندانی ہر کسے داند کہ تو ۔۔۔ نیستی با من بگاہِ شعر گفتن ہم نشیں

من بفضل از تو فزونم تو بمال از من فزوں ۔۔۔ بہتر ست از مال فضل و بہتر از دنیاست دیں

مالِ تو از شہریار شہریاراں گرد گشت ۔۔۔ ورنہ اندر ری تو سرگیں چیدۂ از پارگیں

گر نہ باشد در چنیں حالت مزیدے مر ترا ۔۔۔ عارضے بس باشدت بر لشکر میر مہیں

ہیچ سالے نیست کز دینارسی صد چار صد ۔۔۔ از پئے عرضِ حشم کمتر کنی در آستیں

واں گہے گوئی من از شاہِ جہاں شاکرنیم ۔۔۔ گر نہ ننگ آیدا زیں شہ رحمتِ او بر بند ہیں

باز شرواں شو بدآں جائے کہ داوندت ہمی ۔۔۔ گوشتِ خوکِ مردہ یکماہہ و نانِ جویں

۴۲۶ھ میں سلطان مسعود نے دریاے جیحوں پر پُل باندھے جانے کا حکم دیا۔ اِس کے متعلق منوچہری ایک قصیدہ میں کہتا ہی ؎

جز تو نہ بست گردنِ جیحوں کسے بغل ۔۔۔ وندر ترا ندہیل بہ جیحوں دراں ہزار

دو سال یا سہ سال دراں بود تا بہ بست ۔۔۔ جسری در آبِ جیحوں محمود نام دار

در مدتِ دو ہفتہ بہ بستی تو اے ملک ۔۔۔ جسری در آبِ جیحوں بہ فزاں ہزار بار

دریا بداں سپہ کہ بجیحوں گزاشتی ۔۔۔ دریا نکردہ بود بجیحوں کسے گزار

سالارِ خانیاں را با خیل و با خدم | گردے ہمہ نگون و نگوں بخت و خاکسار
تا بر کسے گرفتہ نہ باشد خدائے خشم | پیش تو ناید و نہ کند با تو چار چار
پور تگیں کہ خشم خدائے اندرو رسید | اورا ازاں دیار دواند بایں دیار
تا گنج او خراب شد و فیل او اسیر | تا روز او سیاہ شد و جان او فگار
او مار بود و مار چو آہنگ او کنی | اندر جہد ز بیم بسوراخ تنگ غار
گر شاہ ناگشت ورا بود زیں قبل | کز تنگ غار ہیچ امیرے نہ گشت مار

مذکورہ بالا ابیات میں شاعر نے واقعیت کا بہت کم لحاظ رکھا ہے اصلی معاملات کو اس قدر رنگینی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی شناخت قریب قریب مشکل ہو گئی ہے۔ پُل کے لئے بیہقی کہتا ہے۔

"وہشتم ماہ ربیع الاول نامۂ رفت سوئے بکتگین چوگانی از محمودی و فرمودہ آمد تا بر جیحون پلے بستہ آید کہ رکاب عالی را حرکت خواہد بود سخت زود ...... و جواب رسید کہ پل بستہ آمد بد و جائے و در میانہ جزیرہ پلے سخت قوی و محکم کہ آلت و کشتی ہمہ بر جائے بود از ان وقت باز کہ امیر محمود فرمودہ بود (بیہقی ص۴۰۰)

جب تمام ضروری سامان اور کشتیاں محمود کے وقت سے تیار تھیں تو ظاہر ہے کہ پُل دو ہفتہ کے اندر اندر آسانی سے ترتیب دیا جا سکتا تھا اس پر شاعر کو فخر اور بے جا فخر کرنے کا موقع ملا کہ جب محمود نے پُل کے لئے دو تین سال لگائے میرے ممدوح نے صرف دو ہفتوں کے اندر اندر تیار کر لیا۔

پور تگیں کے خلاف مسعود نے جس مہم کا ارادہ کیا تھا اُس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وزیر اور سران سپاہ اس مہم کے سخت مخالف تھے چنانچہ وزیر احمد عبد الصمد کی اس کی نسبت یہ رائے تھی جو اس نے ابو نصر مشکانی سے ظاہر کی تھی میں بیہقی کے الفاظ درج کرتا ہوں۔

"وزیر چند بار استادم را گفت می بینی کہ چہ خواہد کرد از آب گزارہ خواہد شد در چنیں وقت بر ماندن پور تگیں بداں کہ وے بختلاں آمد و پنج آب بگزشت ایں کار سست کہ خدائے بداند کہ چوں شود او ہام و خاطر از یں ما جنبد و بو نصر جواب داد کہ جز خاموشی روئے نیست کہ نصیحت کہ بہ تہمت باز گردد ناکردنی ست

و ہمہ حشم می دانستند و بایک دیگر می گفتند بیرون پردہ از ہر جنسے چیزے، و بوسعید مشرف را می فرا کردند تا می بنشست و سود می داشت و چوں پیش امیر رسیدندے برموافقت او سخن گفتندے کہ در خشم می شد۔"

(بیہقی ص ۴۰۴، و ۴۰۵)

اسی ماہ کی انیس تاریخ دوشنبہ کے روز مسعود نے پل سے عبور کیا اور ترمذ پہنچ گیا۔ بائیس کو ترمذ سے کوچ کیا اور اسی ماہ کی سلخ کو چغانیاں پہونچا تیسری ماہ ربیع الآخر بدھ کے روز درہ شومان کی طرف بڑھا کیوں کہ اس طرف بورتگین کا سراغ چلا تھا۔ سردی نے ادھر اپنا زور دکھایا برف باری جاری تھی جتنی تکلیف لشکر نے اس سفر میں اٹھائی پہلے کسی سفر میں نہیں دیکھی تھی۔ نو ربیع الآخر کو وزیر کا خط آیا اس میں تحریر تھا کہ داؤد سلجوقی ایک بڑے لشکر کے ساتھ سرخس سے گوزگاناں کی طرف بڑھ رہا ہے اس کا قصد ہے کہ اندخود کے راستہ سے جیحوں پہونچکر پل توڑدے اور دریا پر قبضہ کرکر اگر خدا نخواستہ پل ٹوٹ گیا تو تکلیف کے علاوہ بڑی رسوائی کا سامنا ہے۔ امیر مسعود اس خط کو دیکھ کر بہت پریشان ہوا بورتگین اس وقت تک سرمان سے نکل چکا تھا اور درہ پر قابض تھا وہاں کے چپہ چپہ زمین سے واقف تھا علاوہ بریں ہوشیار بدرقے اس کے ہمراہ تھے۔ ناچار امیر مسعود بغیر کوئی کام بنائے لوٹا۔ بارہ کو جمعہ کے روز نہایت عجلت میں روانہ ہوا۔ بورتگین اس موقع کا منتظر تھا وقت پاکر بھیڑ پر آپڑا کچھ اونٹ اور کوتل گھوڑے لے گیا جس سے پریشانی اور بدنامی ہوئی۔ (بیہقی ص ۰۰۰)

ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس بیان میں اور منوچہری کے بیان میں بڑا فرق ہے۔ محمودی دور کے شعرا مثلاً عنصری اور فرخی کے اکثر بیانات حرف بحرف تاریخ سے ملتے ہیں لیکن منوچہری اپنے زور بیان قادر الکلامی اور جوش طبیعت کے خاطر واقعات کو بیدردی کے ساتھ قربان کر دیتا ہے۔

منوچہری کے ممدوحین کی فہرست میں یہ نام شامل ہیں :-

(۱) ابوسعید سلطان مسعود بن یمین الدولہ محمود (۲) شمس الوزرا احمد بن عبدالصمد وزیر سلطان مسعود
(۳) بادشاہ ابوالمظفر (۴) فضل بن محمد (۵) ابوالحسن بن الحسن (۶) علی ابن محمد (۷) خواجہ احمد
(۸) خواجہ ابوالعباس (۹) علی بن عبید اللہ (۱۰) ببگقو (۱۱) خواجہ محمد (۱۲) محمد قصری
(۱۳) بوحرب بختیار محمد (۱۴) ابوالحسن بن علی بن موسے عمرانی (۱۵) حمید بوسہل زوزنی دبیر سلطان مسعود

(۱۶) ابو ربیع بن ربیع (۱۷) اسد بن حارث بن منصور امام جیلاں ۔

اَسَدِی طوسی

یورپین تحقیقات مظہر ہے کہ دو اسدی گزرے ہیں جو ایک دوسرے سے باپ بیٹے کا تعلق رکھتے ہیں اور اسدی تخلّص دونوں میں عام ہے ۔ اسدی کلاں کا نام ابو نصر احمد بن منصور طوسی ہے ۔ جو صاحب مناظرہ ہے ۔ دوسرا اسدی خُرد اس کا فرزند جس کا نام علی بن احمد الاسدی الطوسی ہے اور اگرشاسپ نامہ و لغت فرس کا مصنف ہے یہ بیان مجکو لفظاً عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ دو زبردست مغربی مستشرق ڈاکٹر ایتھی اور پروفیسر برون اس کے راوی ہیں میں تسلیم کرتا ہوں ۔

مولانا شبلی کے پیش نظر اگرچہ پروفیسر برون کی تاریخ تھی تاہم وہ اس اہم مغربی انکشاف کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہتے ۔ اِن کی نظر میں پروفیسر "برون کی کھتونی" شاید اس قابل نہ تھی کہ اس پر تضیع اوقات کی جاتی جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شعر العجم میں دونوں اسدیوں میں تخلیط قایم ہو گئی ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

" اقلیم سخن (رزم) کا یہ دوسرا تاجدار ہے ، صاحب آتش کدہ نے اُس کو سلطان محمود کے سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہے " (شعر العجم ص ۱۸۲)

یعنی بسم اللہ ہی غلط کی محمود کے سبعہ سیارہ میں اگر کسی اسدی کا شمار ہو سکتا ہے تو وہ اسدی کلاں ہے اور مولنا اسدی خرد کا حال لکھنے بیٹھے ہیں جو گرشاسپ نامہ کا مصنف ہے ۔ اگر مذکورۂ بالا مغربی نظریہ پر یقین نہ کیا جائے تو بھی مولنا کا بیان غلط ہے اس لیئے کہ صاحب گرشاسپ نامہ سلطان محمود کا ہمعصر نہیں ہے اس کا گرشاسپ نامہ جیسا کہ آیندہ ذکر ہو گا ۴۵۸ھ میں تصنیف ہوا ہے اس لیئے وہ محمود کے بعد کا شاعر ہے ۔ قولہٗ

" عراق سے آذربائیجان آیا ۔ یہاں کا رئیس ابو دلف کرکری تھا " (شعر العجم ص ۱۸۲)

آذربائیجان میں ان ایام میں جیسا کہ قطران تبریزی کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے مملانی خاندان برسر حکومت تھا جو کرکوئی کہلاتا تھا ابو دلف کرکری ، ارّان کا بادشاہ تھا جو شروان آذربائیجان اور بحر خزر کے درمیان واقع ہے ارّان اور ارمن دونوں ابو دلف کی زیر حکومت تھے ۔ نہیں معلوم مولنا کو یہ مغالطہ کیوں کر پیش آیا حالانکہ اسدی کے اشعار سے

جن کو خود مولنا صفحہ ۱۱۶ پر نقل کرتے ہیں یہ امر صاف ظاہر ہے وہ اشعار یہ ہیں ؎ ملک بودلف شہریار زمین + جہاندار ارانی پاک دین
اسدی ان ابیات میں اُس کو ارانی کہتا ہے۔ شبلی فرماتے ہیں :-

" اسدی سب سے پہلا شخص ہے جس نے مصطلحات فارسی پر کتاب لکھی چنانچہ اس کے خاص ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ویانات (کذا) کے کتب خانہ میں موجود ہے سلگین نے اس کتاب کو چھاپ کر شائع بھی کیا ہے" (شعر العجم ص ۱۰۴)

یہ اطلاع "مسٹر برون کی کتاب جلد دوم" سے لی گئی ہے جیسا کہ حاشیہ میں ارشاد ہوا ہے لیکن مولانا پروفیسر برون کا مطلب خاک نہ سمجھے۔ اسدی کی مصطلحات فارسی اس کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کہیں موجود نہیں نہ اُس کو سلگیں نے شائع کیا البتہ اِس کا ایک نسخہ جو پنجشنبہ ۹ ماہ محرم ۷۳۳ھ کو عبدالرحمن بن احمد بن الطیبر نے نقل کیا تھا۔ ڈاکٹر پال ہورن نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا ہے۔ عبدالرحمن کا نسخہ ویانا میں نہیں ہے بلکہ پاپائے روم کے کتب خانہ میں ہے۔ دارالسلطنت ویانا میں اسدی کے قلم کی جو کتاب ہے وہ حکیم ابو منصور موفق بن علی ہروی کی کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ ہے جس کو اسدی نے شوال ۴۴۷ھ میں اپنے قلم سے نقل کیا ہے۔ کاتب نے اپنا نام اِس طرح لکھا ہے۔" علی بن احمد الاسدی الطوسی الشاعر" اِس کتاب کو سلگین نے البتہ ۱۸۵۹ء میں چھاپا ہے۔

اسدی کے نام کو زندہ رکھنے والی اِس کی تصنیف گرشاسپ نامہ ہے۔ ابتداءمیں گرشسپ نامہ کا محرک ابودلف شیبانی کا وزیر محمد بن اسماعیل حصبی ہوا (گرشاسپ نامہ) ؎

مہی بد سزاد و بنیان دین گرانمایہ دستور شاہ زمین
محمد مہ جود و چرخ ہنر سماعیل حصبی مرا و را پدر
ز چرخ روان تا بہ ارمندہ خاک چہ و چون گیتی بدانستہ پاک

باقی اشعار شبلی نے درج کئے ہیں اس لئے میں دہرانا ضروری نہیں سمجھتا۔

جب ابودلف شیبانی کو اسدی کے ارادہ کی اطلاع ہوئی اس نے اپنے ملازم تو لوکی زبانی پیام بھیجا کہ یہ کتاب میرے نام پر لکھی جائے۔ (گرشاسپ نامہ) ؎

بہ پیروزی آورد نزے من پیام گزین خدا لو لو نیک نام
کہ گوید ہمی شاہ فرہنگ جوی بنام من این نامہ را باز گوی

اگر زانکہ فردوسی این را نگفت — تو با گفتۂ خویش گردانش جفت
کنون گر سپہرم نہ سازد کمیں — بگویم بفرمانِ شاہِ زمیں

اس کے بعد اسدی کہتا ہے کہ خاکِ طوس سے دو مثنوی نگار پیدا ہونے پر تم کوئی تعجب نہ کرنا یہ ایک امر واقعہ ہے۔ چنانچہ ؎

دو گویا چنیں خاست باشد ز طوس — چنو شد نگوئی تو باشد فسوس
گزو نامہ را خوب کارے بود — زمن در جہاں یادگارے بود

گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ میں دو سال کی محنت کے بعد ختم ہوا۔ اس کے اشعار کی تعداد دس ہزار ہے۔ شاعر نے خاتمہ پر خود بیان کیا ہے۔ (گرشاسپ نامہ) ؎

شد این داستانِ بزرگ اسپری — بہ پیروزِ روزی و نیک اختری
ز ہجرت بدور سپہری کہ گشت — شدہ چار صد سال و پنجاہ و ہشت
جز آں کاندریں داستاں بد زبن — ز ہر در بسے گرد کردم سخن
چنیں نامۂ ساختم بر شگفت — کہ ہر دانشے زو تواں برگرفت
بہشتست بزمش ز کافور خشک — گیاہش ز عنبر درختاں ز مشک
بسے حور نو کردش آراستہ — از اندیشۂ دوشیزگاں خاستہ
ز پاکی رواں شان ز فرہنگ تن — ز دانش زبان و ز معنی دہن
چناں کم بد اندر سخن پایگاہ — بگفتم بنشتم سپردم بہ شاہ
بر آمد ہمی بیت او دہ ہزار — دو سال اندریں بردہ شد روزگار
مباد آں نہ بینندہ را آفریں — کہ کمتر نویسد یکے بیت ازیں

آخری تاکید کے باوجود گرشاسپ نامہ جس قدر برباد کیا گیا ہے مشکل سے اور کتاب اس قدر برباد ہوئی ہو گی۔ قطران آذربائجان میں اور اسدی ایران میں اس طرزِ شاعری کے مقلد ہیں جس کے خصوصی جراثیم سب سے پہلی بار منوچہری کے ہاں معائنہ میں آتے ہیں۔ یہ صنفِ شاعری صنائع بدائع لفظی لطافت ترکیبوں کی خوش آہنگی، غیر فطری

تشبیہات و استعارات اور صنعت مبالغہ میں اغراق کے لئے مشہور ہے۔ لفظی شان و شوکت اور خیالات کے اظہار میں غیر معمولی تکلف جس کے نمایاں خط و خال ہیں۔

منوچہری اپنے مرکب تشبیہات میں عدیم المثل ہے۔ اسدی نے بعض موقعوں پر اس کی تقلید کی ہے۔ مثلاً یہ شعر

همی تافت خنجر ز گردِ سیاه　　چو ایمانِ پاک از میانِ گناه

دیگر

دو زلفش همه جیم و در جیم دال　　دهن میم و بر میمش از نقطه خال

قطران صنعتِ تجنیس کا حاکم ہے اسدی اس کی بھی پیروی کرتا ہے شعر

بزرگاں بزم اندر آرام رام　　نشستند جفتِ غم انجام جام

لیکن یہ صنعتِ لطیف سچ تو یوں ہے کہ قطران کا حصہ ہے میں اس کے چند اشعار نقل کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا (قطران)

چوں بطرفِ جوئے بنہادہ گلِ خود روئے روئے　　جائے با معشوق می خوردن بطرفِ جوئے جوئے

بردہ از مرجاں بگونہ لالۂ نعماں سبق　　بردہ از مطرب بدستاں بلبلِ خوش گوئے گوئے

بستد از یاقوت و بستد لالہ و گلنار نار　　یافت از کافور و عنبر خیری و شبوئے بوئے

از نسیمِ سوسن و گل گشت چوں قرقیر باغ　　وز دم و زلفِ بتِ من گشت چوں مشکوئے کوئے

چشمِ من چوں چشمۂ آموے گشت از ہجر او　　تن بخوں چوں درمیانِ چشمۂ آموئے موئے

صنعت مبالغہ اس میں شک نہیں اسدی کا خاص حصہ ہے میں بخوف طوالت صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں

بشب مورچہ بر پلاسِ سیاہ (۱) بمودی بہ چشم از دو صد میل راہ

ز گرد نبرد و ز گردِ زمیں (۲) زمیں گشت گردوں و گردوں زمیں

خرد شش چناں دشت بشگافتے (۳) کہ در وے سپاہے گزر یافتے

چناں تیرہ گیتی کہ از لب خروش (۴) ز بس تیرگی رہ نبردی بگوش

فردوسی اور اسدی کی شاعری میں وہی تفاوت ہے جو آمد اور آورد سادگی اور تصنع میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

فردوسی کے ہاں جہاں حلاوت ہے اسدی میں ملاحت جھلک مارتی ہے خدائے سخن کی متانت کے مقابلہ میں اسدی کے ہاں چلبلاہٹ اور بانکپن کا نمک بھی موجود ہے۔ بلند مضمون منتخب الفاظ، چست بندش، جوش و خروش کی تاثیر، چیدہ تشابیہ برجستہ اسمائے صفات نے اسدی کے کلام کو زیادہ شوخ اور سگھڑ بنا دیا ہے۔ زبان کی ترقی، وقت کی مساعدت اور طبیعت کی رنگینی اسدی کے حق میں فیصلہ کے لئے جھکتی ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اصل اصل ہے اور نقل نقل۔

شاہنامہ اور گرشاسپ نامہ میں بہت مضامین عام ہیں بعض موقعوں پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسدی نے شاہنامہ اپنے سامنے رکھ کر گرشاسپ نامہ لکھا ہے۔ مثلاً داستان بیژن کی تمہید کے وہ اشعار جن میں ایک تاریک رات کا منظر کھینچا گیا ہے اور جو شاہنامہ کے قدیم ترین اشعار میں مانے جا سکتے ہیں اسدی اُن کا جواب دیتا ہے۔

شاہنامہ		گرشاسپ نامہ	
شبے چوں شبہ روئے شستہ بقیر	نہ بہرام پیدا نہ کیواں نہ تیر	شبے بد چو زنگی سیہ تر ز زاغ	مہ نو چو در دستِ زنگی چراغ
دگرگونہ آرایشے کردہ ماہ	بسیچ گزر کرد بر پیش گاہ	سیاہیش درہم سیاہی بدیر	چو موج از بر موج دریائے قیر
شدہ تیرہ اندر سرائے درنگ	میاں کردہ باریک و دل کردہ تنگ	چو ہندو بقیر اندر اندودہ روئے	سیہ جامہ و رُخ فروہشتہ موئے
ز تاجش سہ بہرہ شدہ لاجورد	سُپردہ ہوا را بزنگار گرد	چنان تیرہ گیتی کہ از لب خروش	ز بس تیرگی رہ نبردی بگوش
سیاہِ شبِ تیرہ بر دشت و راغ	یکے فرش افگندہ چوں پرِ زاغ	میانِ ہوا جائے جائے ابر دیم	چو اُفتادہ بر چشمِ تاریک نم
چو پولاد زنگار خوردہ سپہر	تو گفتی بقیر اندر اندودہ چہر	جہاں گفتیش دوزخی ہست تار	ہر گوشہ دیو اندر و صد ہزار
نمودم ز ہر سو بچشم اہرمن	چو مارِ سیہ باز کردہ دہن	از انگشت بدشاں ہمہ پیرہن	دماں باد تاریک دود از دہن
ہر آنگہ کہ بر زد یکے بادِ سرد	چو زنگی بر انگیخت ز انگشت گرد	زمیں را کہ از غار دیدار نہ	زباں را رہ و روے رفتار نہ
چناں گشت باغ و لبِ جویبار	کجا موج خیزد ز دریائے قار	بزندانِ شب در بہ بند آفتاب	فروہشتہ بر دیدہا پردہ خواب
فرو ماند گردونِ گرداں ز جائے	شدہ سست خورشید را دست و پائے	فرشتہ گرفتہ ز بس بیم پاس	پری در نہیب اہرمن در ہراس
زمیں زیر آں چادرِ قیر گوں	تو گفتی شدستی بخواب اندروں	بسانِ تنِ بیوراں بد زمیں	ہوا چوں دژم سوگئے دل غمیں
جہاں را دل از خویشتن پُر ہراس	جرس برگرفتہ نگہبان پاس	بر آں سوگ برکردہ گردوں ز شب	رُخِ نیلگوں پُر ز سیمیں سرشک

ستارہ در چشم زنگی ست باز　　تو گفتی یکے آئینہ ستا ز فراز　　زمانہ زباں بستہ از نیک و بد　　نہ آوائے مرغ و نہ ہرّائے دد

فردوسی کے ہاں اکثر تشبیہات مادی اشیا سے تعلق رکھتی ہیں، اسدی کی اکثر تشبیہیں ایسی ہیں جو غیر محسوس ہیں۔ موج دریائے قیر، پیرہن انگشت، زندانِ شب، دو زخ تار و اہمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسدی نے اپنے رسمی مبالغہ کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے اور چوتھے شعر میں اپنی برجستہ طرز میں کہتا ہے کہ دنیا اس قدر تاریک تھی کہ نالہ لب سے نکلتے ہی بوجہ کثرت تاریکی راہ گم کر کے کہیں کا کہیں بھٹک جاتا تھا اور کانوں تک نہیں پہونچ سکتا تھا۔ فردوسی خدائے سخن ہے مرتبہ کی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تاہم اسدی نے جو کچھ زور طبیعت دکھایا ہے لائق تحسین ہے۔

بعض موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اسدی نے فردوسی کے خیالات کو اپنے ہاں لے لیا ہے اور سرقہ کی سرحد ممنوعہ سے ڈانڈا مینڈا جاملا یا ہے۔

شاہنامہ　　　　گرشاسپ نامہ

نشاید فگندن برو سنگ و خاک　　ہر آں چہ خوردی ازو آب پاک　　سزد گر نباید برو خاک شست　　کہ آبے کزو سرو آزاد رست

ازاں پس تو جز گوش مردن مدار　　چو بر بیت سیمیں کند گوشوار　　بودن چہ داری تو چندیں امید　　پیامست از مرگ موئے سپید

یکے داستاں زد بریں مرد مہ　　کہ درویش را چوں برانی ز دہ
بگوید کہ من مہتر دہ بدم　　ہمہ بندہ بودند من مہ بدم　　} یکے را بدہ در ندادند جائے　　ہمی گفت بردہ منم کتخدائے

تاہم اس میں کوئی شک نہیں کر سکتا کہ صاحب گرشاسپ نامہ نے فردوسی کے خیالات سے اپنی شاعری کو چمکایا ہے۔

مثنوی کا ایوان جس کی بنیاد رودکی، ابوشکور اور دقیقی جیسے معماران سخن نے ڈالی تھی فردوسی نے اپنے زمانہ میں اس ایوان کو نہایت بلند اور عالی شان بنا دیا، اسدی نے دھیمے رنگوں میں اس پر بیل بوٹے اور نقش و نگار بنائے، نظامی نے اپنے وقت میں ان رنگوں کو زیادہ شوخ اور لطیف کر دیا۔

اکبر کا آخری دورِ شاعری

(۲)

(از جناب مولوی عبدالماجد صاحب بی اے)

(ج) عشق و تغزل

غزل گو شاعر کی حیثیت سے اکبر کو شہرتِ عام کبھی نہیں حاصل ہوئی، تاہم کلیاتِ اوّل و دوم میں ان کی متعدد غزلیں ایسی درج ہیں جنھیں بلا تامل اساتذہ غزل اُردو کے کلام کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے۔ کلیاتِ اوّل میں جو ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا، حضرت اکبر نے خود اپنی غزل گوئی کے تین دور قایم کیئے ہیں۔ سلسلۂ بیان کے لیے ان میں سے ہر دور کے نمونہ کلام پر ایک نظر کرتے چلنا چاہیئے۔

پہلا دَور تا ۱۸۶۶ء۔ اکبر کا سالِ ولادت ۱۸۴۶ء ہے۔ گویا یہ اُن کی شاعری کے بچپن کا دَور تھا۔ شاعر کا سن بیس سال کے اندر تھا۔ اس وقت وہ عام غزل گویوں کے بالکل ہمنوا نہیں تاہم برجستگی، شوخی، روانیِ طبع و لطفِ زبان کے جوہر اُس وقت بھی نمایاں ہیں اشعار ذیل ملاحظہ ہوں ؎

بے تکلف بوسۂ زلفِ چلیپا لیجیئے — نقدِ دل موجود ہے پھر کیوں نہ سودا کیجئے
دل تو پہلے لے چکے اب جان کے خواہاں ہیں آپ — اس میں بھی مجھ کو نہیں انکار اچھا لیجئے
پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیر زنداں میں رہو — وحشتِ دل کا ہے ایما راہ صحرا لیجئے

سنتا ہوں چمن میں جو تری زمزمہ سنجی — یاد آتی ہے بلبل مجھے تقریر کسی کی

پھر گئی آپ کی دو دن میں طبیعت کیسی — یہ وفا کیسی تھی صاحب! یہ مروّت کیسی
جس حسیں سے ہوئی اُلفت وہی معشوق ہوا — عشق کس چیز کو کہتے ہیں طبیعت کیسی
کوچۂ یار میں جاتا تو نظارہ کرتا — قیس آوارہ ہے جنگل میں یہ وحشت کیسی

جذبۂ دل نے مرے تاثیر دکھلائی تو ہے — گھنگرؤں کی جانب در دیکھ صدا آئی تو ہے
عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہے — پر کروں کیا اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے
آپ کے سر کی قسم میرے سوا کوئی نہیں — بے تکلف آئیے کمرہ میں تنہائی تو ہے

دوسرا دور ۱۸۶۶ء تا ۱۸۸۸ء ۔ رندی وہوسناکی کے مضامین اس دور میں بھی باقی ہیں تاہم جذبات نگاری کی بنیاد پڑ چکی ہے، اور رنگِ تغزل زیادہ نکھر گیا ہے ۔ لطفِ زبان وحُسن بیان کا سر رشتہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا ۔ فرماتے ہیں ؎

آج آرایشِ گیسوئے دوتا ہوتی ہے — پھر مری جان گرفتارِ بلا ہوتی ہے
شوقِ پابوسیِ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز — گھاس جو اُگتی ہے تربت پہ حنا ہوتی ہے
پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں — سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے
جس نے دیکھی ہو وہ چتون کوئی اس سے پوچھے — جان کیونکر ہدفِ تیرِ قضا ہوتی ہے
ہوں فریبِ ستمِ یار کا قائل اکبرؔ — مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا — آنکھ اُن سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا
جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا — بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا
میں نزع میں ہوں آئیں تو احسان ہے اُن کا — لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشہ نہیں ہوتا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یار نے کچھ خبر لی، دل نے جگر نے کیا کیا ‌‌‌ ‌ نالۂ شب سے کیا ہوا آہِ سحر نے کیا کیا
کھل گیا سب پہ حالِ دل ہنستے ہیں دوست برملا ‌ ‌ ضبط کیا نہ رازِ عشق، دیدۂ تر نے کیا کیا

دورِ سوم ۔ ۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۰ء ۔ اس دور کا کلام رنگِ تغزل میں پختگی کا نمونہ ہے۔ طرزِ ادا میں سنجیدگی زیادہ پیدا ہو گئی ہے، مضمون آفرینی پر زیادہ توجہ ہو گئی ہے، غزل میں اخلاقی و روحانی معنویت کی آمیزش بے تکلفانہ کی جانے لگی ہے، اور جا بجا ظرافت کا چٹخارہ بھی آنے لگا ہے۔ پھر بھی مسلم و متعارف رنگِ تغزل ہے کوئی مصرعہ الگ نہیں پڑنے پاتا ۔ مثلاً

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا ‌ ‌ بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس ‌ ‌ ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش ‌ ‌ طالبِ زمزمۂ بلبلِ شیدا نہ ملا
واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے ‌ ‌ کعبہ کو کر دیا گم اور کلیسا نہ ملا
ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہیں اکبر ‌ ‌ مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

دل مرا اُن پہ جو آیا تو قضا بھی آئی ‌ ‌ درد کے ساتھ ہی ساتھ اس کی دوا بھی آئی
آئے کھولے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا ‌ ‌ میں بھی آیا ترے گھر میری بلا بھی آئی
وائے قسمت کہ مرے کفر کی وقعت نہ ہوئی ‌ ‌ بت کو دیکھا تو مجھے یادِ خدا بھی آئی
ہو گئیں آغازِ جوانی میں نگاہیں نیچی ‌ ‌ نشہ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

غنچۂ دل کو نسیمِ عشق نے وا کر دیا ‌ ‌ میں مریضِ ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا
شانِ محبوبیِ صانع کا نشاں کہتا ہے یہ ‌ ‌ ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا
کیا مرے اک دل کو خوش کرنے پہ وہ قادر نہیں ‌ ‌ ایک کُن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا
سب کے سب باہر ہوئے ہوش و خرد، وہم و تمیز ‌ ‌ خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردہ کر دیا
شاہدِ بزمِ ازل نے اک نگاہِ ناز سے ‌ ‌ عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا

شورِ شیریں کا مزار کھا سرِ فرہاد میں — قیس کو دیوانہ، انداز لیلیٰ کر دیا

گردنِ پروانہ میں ڈالی کمندِ شوقِ شمع — رنگِ گُل کو دیدۂ بلبل کا پھندا کر دیا

جس نے یہ سب کچھ کیا اکبر میں سمجھے کیا لکھوں — اُس نے مجھ کو کیا کیا، دل کو مرے کیا کر دیا

وہ حجاب اُن کا آج تک نہ گیا — نہ گیا اُن کے دل سے شک نہ گیا

اِک جھلک اُن کی دیکھ لی تھی کبھی — وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا — اچھا ہوا مزا تو محبت کا مِل گیا

ایسے ستم کیے کہ مرا قلب ہل گیا — اور اس طرح کہ سینہ کا ہر داغ چھل گیا

تیرا پتہ چمن کو صبا سے جو مل گیا — بُلبل کو وجد آگیا غنچہ بھی کھل گیا

خوش قسمتی پہ اپنی بجا ہی کروں جو ناز — اپنے ہی دل میں مجھ کو مرا رب بھی مل گیا

اُلجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے — مانگی نہ مدد دل نے مرے طولِ امل سے

اُن کی نگہِ مست ہے لبریز معانی — ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

ادراک نے آنکھیں تپ اوہام میں کھولیں — واقف نہ ہوا روشنیِ صبحِ ازل سے

قرآن ہی شاہد کہ خدا حُسن سی خوش ہی — کس حُسن سے، یہ بھی تو سُنو، حسنِ عمل سے[۱]

---

[۱] اس شعر سے متعلق ایک لطیفہ جو خود حضرت اکبر کی زبان سے سُنا تھا، اس قابل ہی کہ اسے بھی ضبط تحریر میں لے آنا چاہیئے۔ لکھنؤ میں منشی حاجی اطہر علی مرحوم کاکوروی ایک نہایت راسخ الاعتقاد اور متقشف مذہبی شخص تھے۔ اکبر صاحب فرماتے تھے کہ "لکھنؤ میں ایک مشاعرہ تھا۔ یہ غزل مشاعرہ کی ہی۔ جب شمع میرے سامنے آئی، تو میں نے یہ غزل پڑھنا شروع کی۔ جوں ہی اس شعر پر پہنچا اور پہلا مصرعہ زبان سے ادا کیا کہ منشی صاحب مرحوم کے چہرہ پر نگاہ پڑی۔ اُن کا تقشف و زہد قرآن کے ساتھ اس شاعرانہ آزادی کا متحمل نہ ہو سکا۔ تیوروں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ دوسرا مصرعہ سُننے کے بعد رائے قایم فرمائیے۔ یہ کہتے ہی دوسرا مصرعہ سُنایا، تو منشی صاحب پھڑک اُٹھے۔ بے اختیار اُٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور بہت دیر تک داد دیتے رہے۔" شاعر و واعظ کی جنگ روزِ ازل سے چلی آتی ہی۔ کوئی صاحب اگر ان

(باقی بر صفحہ آیندہ)

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ — ہیبت ترے پیغام کی ظاہر ہی اجل سے
درجہ متحیّر کا ہی بے خود سے فزوں تر — ہی روح کو امید ترقی کی اجل سے
بحثِ کہن و نو ہیں سمجھتا نہیں اکبر — جو ذرّہ ہی موجود ہی وہ روزِ ازل سے

دورِ چہارم ۔ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۲ء ۔ یہ کوئی مستقل دور نہیں اسے دورِ سوم کا تکملہ ہی سمجھنا چاہیئے ۔ دورِ سوم تک کا کلام کلیاتِ اوّل میں موجود ہی ۔ اس کے بعد سے چار برس کا کلام کلیاتِ دوم میں ہی، اس لیئے اس حصہ کے لیئے ایک جداگانہ دور قایم کیا گیا ۔ کلیاتِ اول میں بیشتر حصّہ غزلیات ہی کا ہی، کلیاتِ دوم میں یہ تناسب گھٹ گیا ہی اور جتنا حصّہ غزلیات کا ہی، اس میں بھی چند اخلاقی، فلسفیانہ، سیاسی و عارفانہ مضامین شامل ہیں ۔ تاہم عاشقانہ حصّہ بھی لطف و کیف سے خالی نہیں ۔ کہنہ مشقی سے پختگی بدرجۂ غایت پیدا ہو گئی ہی، اور استادی کا رنگ ایک ایک شعر سے پیدا ہی ۔ طبیعت کی آمد، جدّتِ مضامین کے ساتھ ردیف و قافیہ میں بھی ندرت کی بہار دکھانے لگی ہی ؎

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا — اب فکرِ آخرت ہی دنیا کو خوب دیکھا
اس نے خدا کو مانا وہ ہو رہا بتوں کا — یا اس نے خوب سمجھا یا اس نے خوب دیکھا

نہ یہ رنگِ طبع ہوتا نہ یہ دل میں جوش ہوتا — یہ جنوں اگر نہ ہوتا تو کہاں یہ ہوش ہوتا
غمِ دہر سے بچاتا ہی بشر کو مست رہنا — مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا
تمہیں دیکھ سنکے فطرت نے ہیں نقش کھینچے ورنہ — نہ یہ ہوتی چشمِ نرگس نہ یہ گل کا گوش ہوتا
دل و دین سب انہیں کے صدقہ جو وہ خود نما نہ ہی — کوئی زندہ ہی نہ رہتا جو وہ خود فروش ہوتا
حسنِ نظامی اکبر کا کلام سن کے بولے — تجھے میں ولی سمجھتا جو تو خرقہ پوش ہوتا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۹) معرکہ آرائیوں کی تاریخ مرتب کرنے پر کبھی توجہ فرمائیں، تو یقین ہی کہ اس واقعہ کو بھی ضرور درج کرینگے ۔ شاعرانہ فتح مندی کی اس سے زیادہ دلچسپ اور کیا مثال ہوگی ۔

بتوں سے میل، خدا پر نظر، یہ خوب کہی ‌ ‌ ‌ شبِ گناہ و نمازِ سحر، یہ خوب کہی

تمھاری خاطرِ نازک کا ہی خیال فقط ‌ ‌ ‌ وگرنہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر، یہ خوب کہی

شبابِ بادہ و فکرِ مآل ار چہ خوش ‌ ‌ ‌ جنونِ عشق و خیالِ خطر یہ خوب کہی

سوالِ وصل کروں یا طلب ہو بوسہ کی ‌ ‌ ‌ وہ کہتے ہیں مری ہر بات پر، یہ خوب کہی

آہ دل سے جو نکالی جائے گی ‌ ‌ ‌ کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

یاد اُن کی ہی بہت عزلت پسند ‌ ‌ ‌ آہ بھی دل سے نکالی جائے گی

نزع کہتی ہی کہ روٹھی تجھ سے جاں ‌ ‌ ‌ حشر کہتا ہی منا لی جائے گی

یاد ابرو میں ہی اکبر محو کیوں ‌ ‌ ‌ کب تری یہ کج خیالی جائے گی

ایک صوتِ سرمدی ہی جس کا اتنا جوش ہی ‌ ‌ ‌ ورنہ ہر ذرّہ ازل ہی تا ابد خاموش ہی

آئینہ سے بھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس ‌ ‌ ‌ شرم کہتی ہی کہ یہ بھی صاحبِ آغوش ہی

حضرت منصور کہتے ہیں انا بھی حق کے ساتھ ‌ ‌ ‌ دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہی

شوقِ وصلِ شعلہ رویاں کیوں نہ ہو برسات میں ‌ ‌ ‌ ابر کو بھی دیکھتا ہوں برق در آغوش ہی

رنگِ شراب سے مری نیت بدل گئی ‌ ‌ ‌ واعظ کی بات رہ گئی ساقی کی چل گئی

تیار تھا نماز پہ میں سُن کے ذکرِ حور ‌ ‌ ‌ جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمہ پہ شاد ہی ‌ ‌ ‌ صیاد مطمئن ہی کہ کانٹا نگل گئی

چمکا ترا جمال جو محفل میں وقتِ شام ‌ ‌ ‌ پروانہ بے قرار ہوا شمع جل گئی

حسرت بہت ترقیِ دختر کی تھی اُنھیں ‌ ‌ ‌ پردہ جو اُٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

دورِ پنجم آخری دور میں جو ہمارے اس تبصرہ کا اصل موضوع ہے، تغزل کا رنگ بہت ہلکا پڑ گیا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں غزل بہت کم کہتے تھے۔ عموماً سیاسی، اخلاقی، عارفانہ وظریفانہ نظمیں کہا کرتے تھے۔ غزلیات کے عنوان سے کلیاتِ سوم میں جتنے صفحات وقف کیے گئے ہیں، تعداد میں زائد ہیں، لیکن درحقیقت غزلیت کا عنصر اُن میں بہت ہی کم ہے۔ عموماً وہ واقعاتِ حاضرہ پر شاعر کے خیالات و افکار ہیں، جنھیں غزل کے ساتھ میں موزوں کر دیا گیا ہے۔ یہ خصوصیت ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی کسی قدر موجود ہے، درمیانی کلام میں بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ آخری زمانہ میں یہ خصوصیت تمام دیگر خصوصیات پر غالب آگئی۔ کلیات اوّل کے پہلے ایڈیشن کے شائع ہونے پر کسی ناقد نے اپنی رائے یہ ظاہر کی تھی کہ :۔

"مصنف بہ نسبت شاعر کے بہت زیادہ ایک تھنکر (سوچنے والا، صاحبِ فکر) یا فلاسفر ہے، جس نے اپنے خیالات کو خوبی کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔"

حضرت اکبر کو یہ رائے نہایت پسند آئی۔ اسے وہ اپنی حقیقی داد سمجھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جوں جوں اُن کی شاعری نکھرتی گئی، وہ روز بروز اس خیال کے زیادہ مصداق ہوتے گئے۔ مثال کے طور پر کلیاتِ سوم سے دو ایک غزلیں لے کر جانچ کی جاتی ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ قالب اگرچہ غزل کا ہے، لیکن روح اس میں غزل کی نہیں۔ جام وسبو اب بھی غزل ہی تھا، لیکن ان کے اندر اکثر شرابِ عشق وتشبیب کا ایک قطرہ بھی نہ ہوتا، بلکہ کہیں اخلاق وموعظت کی یخنی ملتی تھی، کہیں طریقت ومعرفت کا آبِ طہور جھلکتا ہوتا تھا، کہیں ظرافت کی چاشنی سیاسیات کے شربت میں شیر وشکر ہوتی نظر آتی تھی۔

ذیل کی غزل، غزل ہے، یا ایک درسِ تصوف ؎

نگاہ اُٹھی ہے احساسِ ماسوا کے لیئے	کہاں ہے دل وہ ارنی کہے اِسے خدا کے لیئے
رواں ہو کارِ جہاں کیوں ہماری مرضی پر	خدا ہمارے لیئے ہے کہ ہم خدا کے لیئے
عمل خدا کے لیئے ہو تو اس کا کیا کہنا	مگر ریا یہ بُری صرف واہ وا کے لیئے

لیلائے تغزل کے مجنون محمل یار کو شناخت کر کے بیتابانہ اس کی طرف لپکتے ہیں قریب پہونچکر دیکھتے ہیں، تو محمل کے اندر نہ کسی زہرہ جبیں کا پتہ ہے نہ اُس کے عشوہ وانداز کا، اور نہ اُس کے روئے تاباں و زلف عنبریں کا، بلکہ ان کے بجائے ایک شیخ وقت مع اپنے جُبّہ و دستار کے تسبیح وتہلیل میں مصروف نظر آتے ہیں ؎

خدا کے نام کا ہے احترام عالم میں	نہ صرف آپ میں ہم میں، تمام عالم میں

اِسی کا نام نہ کیوں مرکزِ زباں ہو جائے
کہ اختلاف سے خالی ہو کام عالم میں

خدا پرست کو کافی ہے مثلِ ابراہیم
زوالِ شمس و قمر صبح و شامِ عالم میں

یہی مشن تھا جنابِ رسول اکرمؐ کا
اور آج اُنھیں کا تو روشن ہے نام عالم میں

لطفِ سماع و ذوقِ نظر کے شیدائی دُور سے محفل کی دھوم سُن کر دوڑتے ہوئے آتے ہیں، اور محفل کی رنگینیوں کے نقوش اپنے متخیلہ کو لبریز کیے ہوئے ہیں، لیکن جلوہ گاہ کا جب پردہ اُٹھتا ہے، تو "جنت نگاہ" و "فردوس گوش" کا سارا تخیل وہم باطل ثابت ہوتا ہے، نہ چنگ ہے نہ ساز، نہ غمزہ ہے نہ ناز، محفل میں بجائے ساز کے سوز ہے، لبوں پر بجائے واہ کے آہ ہے، آنکھیں نم ہیں، اور چہروں پر بجائے ہنسی کی کھلکھلاہٹ کے خشیت الٰہی سے ہیبت طاری ہے۔ درمیان میں ایک صاحبِ حال درویش اپنی آگ سے دوسروں کو گرما رہے ہیں ؎

گو سعی ہوائے شوق نے کی بو اُس کی نہ نکلی محفل سے
مجنوں نے اُڑائی خاک بہت لیلےٰ نے نہ جھانکا محمل سے

دُنیا کے تغیر کا نہیں جس شیدائے جمالِ باری کو
پروانے کو مطلب شمع سے ہے کیا کام ہے رنگِ محفل سے

احساس ہی ایذا کا نہ ہوا فریاد و فغاں میں کیا کرتا
جس وقت تہِ خنجر تھا گلا آنکھ اپنی ملی تھی قاتل سے

زُہدِ خشک سے طبیعت اُکتا گئی ہو، اور دل ظرافت کی گدگدی کا طالب ہو، تو یہ رنگ بھی کہیں دور نہیں۔ ندرت وافی کے طلسم ساز کے لیے آگ کو برف بنا کر پیش کر دینا کیا مشکل ہے، اِس رنگ کی غزلیں بھی موجود ہیں ؎

اب نہ خنگیِ علم نہ جھنڈا ہے
صرف تعویذ اور گنڈا ہے

کیا ہے باقی جنابِ قبلہ میں
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولیس
ہے زباں گرم قلب ٹھنڈا ہے

غرض ہے آخری دَور کا جو حصۂ غزلیات کے زیرِ عنوان رکھا گیا ہے، اس کا بیشتر جزو ایسا ہے، جیسے رسمی و جزوی و لغوی معنی میں غزل و تغزل سے کوئی واسطہ نہیں۔

با ایں ہمہ جب کبھی غزل سرائی پر آئے ہیں، پورے عاشق بن گئے ہیں۔ جو کچھ بھی عاشقانہ رنگ میں کہا ہے، خوب کہا ہے۔ اپنے مرتبۂ کمال کو اس رنگ میں بھی قایم رکھا ہے، اور درجۂ اُستادی کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ لُطفِ زبان و سلاست بیان ان کی غزل کی جان ہے۔ تنقید و اخلاق نے بعض ممتاز غزل گویوں کو برباد کر دیا ہے، لیکن اکبر کا گلستان

ان کانٹوں سے بالکل پاک ہے۔ بیان کی لطافت کے ساتھ ساتھ خیال کی بلندی بھی موجود رہتی ہے۔ صورت کے بناؤ سنگار میں اتنا محو نہیں ہوتے کہ سیرت کی تہذیب و شائستگی سے غافل ہو جائیں۔ جانتے ہیں کہ کاروانِ سخن میں سب ہی طرح کے لوگ شامل ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو محض محمل کی خوش وضعی و خوشنمائی سے اپنا جی خوش کر لینگے۔ بعض ایسے ہیں جو محمل نشیں کی زیارت کیئے بغیر دم نہ لینگے۔ یہ ناقہ بانِ سخن دونوں کے دلوں کی ڈوری اپنے ہاتھ میں لیئے ہوئے ہے۔

ایک غزل میں رسمی شعراء کے خلاف، تماشا گاہ فطرت کا نظارہ کرتے ہیں، اور فطرت کے کھلے ہوئے میدان میں وہ دن دوپہر مزے لوٹتے ہیں، جن کی تلاش دوسرے شاعروں کو شبہائے وصال میں اپنے نشاط خانوں کی چار دیواری کے اندر رہا کرتی ہے۔ دوسروں کو جو لطف خلوت میں بھی نصیب نہیں، وہ انھیں جلوت میں ہمہ وقت حاصل ہے۔ لیکن پھر آخر مشرقی شاعر کے جذبات رکھتے ہیں، اس کو مقطع میں نباہا ہے ؎

جلوہ عیاں ہے قدرتِ پروردگار کا | کیا دل کشا یہ سین ہے فصل بہار کا
نازاں ہیں جوشِ حسن پہ گلہائے دلفریب | جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم ابھار کا
ہیں دیدنی بنفشہ و سنبل کے پیچ و تاب | نقشہ کھنچا ہوا ہے خط و زلفِ یار کا
سبزہ ہے یا یہ آبِ زمرد کی موج ہے | شبنم ہے، بحر یا گہرِ آبدار کا
مرغانِ باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں | اور ناچ ہو رہا ہے نسیم بہار کا
موجِ ہوا و زمزمۂ عندلیب مست | اِک سازِ دل نواز ہے مضراب و تار کا
ابرِ تنک نے رونقِ موسم بڑھائی ہے | غازہ بنا ہے روئے عروسِ بہار کا
افسوس اس سماں میں بھی اکبر اداس ہے | سوہانِ روح ہجر ہے اک گلعذار کا

عام شعراء، جو معنویت کو پسِ پشت ڈال کر محض الفاظ کی تلاش خراش میں مشغول رہا کرتے ہیں، ان کی شاعری پر یہ حقیقی شاعر کس قدر صحیح شاعرانہ رائے کا اظہار کرتا ہے ؎

معنی کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیاں | وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خون کا

ذیل کی غزل میں حسن و عشق کے پامال مضمون کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہونچا دیا ہے، آخری شعر اس پایہ کا ہے کہ کہنے والے کی نجات کے لئے بس کرتا ہے ؎

گھٹتا جاتا ہے مری نظروں میں معبودِ مرا　　بڑھتا جاتا ہے شمار اُن کے خریداروں کا

بحث میں عفو و سزا کے یہ لڑے مرتے ہیں　　فیصلہ کر ہی دو اب اپنے گنہگاروں کا

بے خطر پھرتا ہوں بازارِ جہاں میں ہر سُو　　کیسہ خالی ہے تو کیا خوف ہے عیّاروں کا

فطرت اُٹھی ہے شفاعت کو ملائک ہیں خموش　　حشر ہے عشق و محبت کے گنہگاروں کا

عشق کا لفظ ہر شعر گو اور ہر شعر خوان کی زبان پر ہے، ہر نوجوان عشق و عاشقی کا دم بھرتا ہے، عاشقوں کی تعداد اس وقت تک حدِ شمار سے متجاوز ہو چکی ہے، شعرا ہر پہلو سے اس مضمون کو باندھ چکے ہیں، دفتر کے دفتر شرح عشق میں لکھے جا چکے ہیں، لیکن آج تک کوئی بھی الفاظ کی مدد سے اس کے مفہوم کو واضح کر سکا ہے؟ جتنا جی چاہے لکھیے، جتنا جی میں آئے کہئے، لیکن یہ سب محض لفّاظی و زبان آوری رہیگی، عشق کی حقیقت نہ واضح ہو سکیگی۔ اگر اس کیفیت کو کتنے موزوں الفاظ میں اور کس نادر اسلوب کے ساتھ ادا کرتے ہیں ؎

عشق میں حُسنِ بیان وجہِ تسلّی نہ ہوا
لفظ چمکا مگر آئینۂ معنی نہ ہوا[1]

ذرا اسلوبِ بیان کی بلاغت دیکھنا۔ شاعر کو اپنی طاقت لسانی اور اپنی قوتِ گویائی پر دعویٰ ہے، بڑے سے بڑے پیچیدہ مسئلوں کو وہ باتوں باتوں میں سمجھا دیتا ہے، دقایق کی گتھیاں وہ ایک اشارہ میں سلجھا دیتا ہے، اسرار و رموز کو وہ دو فقروں میں سامعین کے ذہن نشین کر دیتا ہے۔ "حُسنِ بیان" اِس ساری کیفیت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ لیکن عاشق ہونے کے بعد اسے نظر آتا ہے کہ اِس کی ساری قوتِ گویائی جس پر اسے ناز تھا، بیکار رہی۔ یہ نہیں کہ اس کی قوت میں کچھ ضعف آگیا ہو۔ وہ جوں کی توں ہے۔ الفاظ کا ذخیرہ وہی ہے، ملکۂ بیان وہی ہے، قدرتِ زبان وہی ہے، الفاظ اب بھی بہت ہی سجل اور سڈول زبان سے نکلتے ہیں، تقریر اب بھی اُسی طرح بلیغ، شستہ اور دل نشین ہے، یہ سارا مفہوم "لفظ چمکا" سے ظاہر ہو رہا ہے، یہ سب کچھ ہے، پھر بھی کوئی بات تو ایسی ہے کہ معنی کی توضیح نہیں ہو پاتی۔ کیفیاتِ قلبی کا عکس دوسروں پر نہیں پڑنے پاتا۔ شیشہ میں آب و تاب چمک دمک پوری طرح موجود ہے، لیکن عکس قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ ضمناً یہ پہلو بھی ("وجہ تسلّی نہ ہوا" سے) آگیا ہے، کہ تسلّی کا تعلق لفظ و زبان سے

---

[1] مرزا کا وہ مطلع یاد کیجئے ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

نہیں، بلکہ قلب اور اُس کے احساس سے ہے۔

اسی زبان میں ایک دوسرا شعور بھی ہے، وہ افسردگی، یاس و حرمان نصیبی کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے۔ اس کی قدر غم کے آخری مدارج پر پہنچ کر ہوتی ہے ؎

دل میں کہتے تھے کہ یہ ہوگا وہ ہوگا لیکن
کٹ گئی عمر اُمیدوں ہی میں کچھ بھی نہوا

دَورِ اوّل کے برخلاف دَورِ آخر کی اکثر غزلوں کی تان، یاس و افسردگی کی آہوں پر آکر ٹوٹتی ہے۔ لذّاتِ دنیا کا موہوم و ناقابلِ اعتنا ہونا، دنیا کی بے ثباتی، اور اس سے اپنی بے تعلقی، یہ موضوع اکثر غزلوں میں مشترک ہے۔ ذیل کی غزل انھیں جذبات کی ترجمان ہے۔ بعض تشبیہوں کی نُدرت و لطافت قابلِ داد ہے ؎

دُنیا میں ہوں دُنیا کا طلبگار نہیں ہوں — بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زندہ ہوں مگر زیست کی لذّت نہیں باقی — ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
اِس خانۂ ہستی سے گزر جاؤں گا بے لوث — سایہ ہوں فقط نقش بدیوار نہیں ہوں
افسردہ ہوں عبرت سے دوا کی نہیں حاجت — غم کا مجھے یہ ضعف ہے بیمار نہیں ہوں
وہ گل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے — اُلجھوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں ہوں
یارب مجھے محفوظ رکھ اُس بُت کے ستم سے — میں اُس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں
گو دعوئے تقوےٰ نہیں درگاہِ خدا میں — بُت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں
افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں اکبرؔ — کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

دُنیا میں رہ کر دُنیا سے بے لوث و بے تعلق رکھنے کو بہت سے شاعروں نے باندھا ہے، لیکن یہاں پہلے اور تیسرے شعر میں جن لطیف و دل نشیں تشبیہات کی مدد سے یہ مضمون باندھا گیا ہے، وہ اکبر ہی کا حصہ تھا۔ ضعف کا مضمون بھی پامال ہو چکا ہے، لیکن اکبر ایک نیا پہلو یہ نکالتے ہیں کہ غم و افسردگی سے میں اس قدر ضعیف و لاغر ہوں، کہ لوگ مجھے بیمار سمجھ رہے ہیں، اور دوا کی فکر میں ہیں (شعر ۴)۔ چھٹے اور ساتویں شعر میں سیاسی مضامین پر تغزل کا غلاف چڑھایا ہے۔

عشق کا دم بھرنے والے لاکھوں بوالہوس موجود ہیں، لیکن واقعی عشق رکھنے والے کہیں دو چار ہی ملینگے۔ آہیں سب

کرتے ہیں لیکن مجنوں کا سوز کسی کی آہ میں نہیں ملتا۔ انا الحق کی صدا لگانے والے گلی گلی میں مل جائینگے، لیکن دار پر جانے کے لیئے ایک منصور ہی نکلیگا۔ دُنیا کی عام خلقت کو سوزِ عشق سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا، اس کی اہلیت مخصوص اشخاص میں ہوتی ہی، اس مفہوم کو یہ شاعر یوں ادا کرتا ہی ؎

باطن بہت ہیں ایسے جو مشتعل نہیں ہیں
سینہ میں سب کے دل ہیں سب اہلِ دل نہیں ہیں

اس مضمون کو ایک مطلع میں بھی ادا کیا ہی ؎

مقبول جو ہوں شاذ ہیں، قابل تو بہت ہیں آئینہ کے مانند ہیں کم، دل تو بہت ہیں

"مقبول" "قابل" کے تقابل کو جس خوبی سے نباہا ہی وہ بھی قابلِ داد ہی۔

اس زمین میں ایک اور شعر بھی ہی، اور وہ بھی اس مضمون سے متعلق ہی ؎

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنھیں ملتی ہی لذّت یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

بسملِ تیغ تو ہزار ہا نکل آئینگے، لیکن اس تڑپ میں لذت پانے والے کتنے نکلینگے؟ مجاز، حقیقت، سیاسیات و معرفت، جس پہلو سے چاہیئے، اس شعر کو لیجئے۔ واقعیت سے کوئی پہلو خالی نہ نکلیگا۔

عاشق یہ خوب ہی جانتا ہی کہ کوئے قاتل میں پھرنا جان سے ہاتھ دھونا ہی، لیکن اگر انجام بینی اس قصد سے باز رکھے اور دل پر اسے اتنا ہی قابو حاصل رہے، تو پھر عاشق کیوں کہلائے ؎

ذوقِ ہوائے کوچۂ قاتل کو کیا کروں مُہلک سہی یہ شوق مگر دل کو کیا کروں

اس کی تڑپ اس کا سوز، اس کا جوش و خروش، ان میں سے کوئی شے وہ اپنے قصد و اختیار سے نہیں پیدا کرتا۔ یہ ساری کیفیات اضطراری ہوتی ہیں، اس کا متأثر قلب اس سے خود بخود یہ سب کچھ کراتا رہتا ہی ؎

اظہارِ اضطراب کا شائق نہیں ہوں میں پہلو میں لیکن اس دلِ بسمل کو کیا کروں

ناصح کہتے ہیں کہ نظارۂ گل ترک کردو تو دل قابو میں آجائیگا، اور عقل ٹھکانے آجائے گی۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہوا کی مستی اور دوسرے عاشقوں کی صدائیں کب دل پر قابو رہنے دینگی ؎

قطعِ نظر گلوں سے، نہیں مانعِ جنوں بوئے بہار و شورِ عنادل کو کیا کروں

داغؔ صاحب کی ایک مشہور غزل ہے ؎

بات میری کبھی سُنی ہی نہیں　　　جانتے وہ بُری بھلی ہی نہیں

اس کا یہ شعر زباں زد عام ہوگیا ہے ؎

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد　　　ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

اِس زمین میں اکبرؔ نے جو گُل ریزی کی ہے، ذرا اس کی بھی سیر کرنا ؎

چرخ سے کچھ اُمید تھی ہی نہیں　　　آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں　　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
چاہتا تھا بہت سی باتوں کو　　　مگر افسوس اب وہ جی ہی نہیں
جرأت عرضِ حال کیا ہوتی　　　نظرِ لطف اُس نے کی ہی نہیں
اس مُصیبت میں دل سے کیا کہتا　　　ایسی کوئی مثال تھی ہی نہیں
آپ کیا جانیں قدرِ "یا اللہ"　　　جب مُصیبت کوئی پڑی ہی نہیں
شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا　　　میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں
پوچھا اکبرؔ ہے آدمی کیسا　　　ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

"فالتو" جیسے غیر فصیح لفظ کو کس خوبصورتی سے کھپایا ہے، اور ایک قافیہ "سوسائٹی" کا لانا اکبر کا مخصوص کمال ہے۔ مظالم فلک کا شکوہ شاعروں کو روزِ ازل سے رہا کیا ہے، اکبر نے سب کے تجربات سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ سرے سے کوئی آرزو ہی فلک سے نہیں قایم کی۔ اور مزے میں رہے (شعرا) پانچویں شعر میں ایک نیا مضمون باندھا ہے۔ مُصیبت زدہ کی تسکین کے لیئے دوسروں کے مصائب کی مثال اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے، لیکن ہمارے شاعر کو جن مُصائب کا سامنا ہوا ہے، انکی کوئی نظیر اب تک موجود ہی نہیں ہوئی ہے، وہ کس کی مثال سے اپنے دل کو تسکین دے۔ مصایب کے فوق الحد ہونے کا یہ ایک نادر پیرایۂ اظہار ہے۔ چھٹے اور ساتویں شعر کا تعلق ذاتی تجربہ سے ہے۔ اُن کی داد دینا بغیر "آپ بیتی" کی مدد کے ممکن نہیں۔

ایک غزل اور ملاحظہ ہو ؎

جلوہ ساقی و مے جان لیے لیتے ہیں — شیخ خوش ہوں کہ خفا ہم تو پیے لیتے ہیں[1]

دل میں یاد اُن کی جو آتے ہوئے شرماتی ہے — درد اُٹھتا ہے کہ ہم آڑ کیے لیتے ہیں

دَورِ تہذیب میں پریوں کا ہوا دَورِ نقاب — ہم بھی اب چاکِ گریباں کو سیے لیتے ہیں

خودکشی منع، خوشی گم، یہ قیامت ہے مگر — جینا ہی کتنا ہے اب، خیر جیے لیتے ہیں

لذتِ وصل کو پروانہ سے پوچھیں عشاق — وہ مزا کیا ہے جو بے جان دیے لیتے ہیں

دوسرا شعر عاشقانہ رنگ میں لاجواب ہے۔ عارفانہ پہلو بھی ہے۔ کتنا سچا مضمون ہے، کہ بغیر درد کے اُن کی یاد پیدا ہی نہیں ہو سکتی، اور اسے کس بانکپن سے ادا کیا ہے۔ آخری شعر بھی اسی رنگ میں ہے۔ تیسرے اور چوتھے شعر میں شاعر پھر اپنے اصلی عالم میں چلا گیا ہے۔

اچھوتے اور نامانوس قافیہ لا کر کلام میں شعریت باقی رکھنا، بلکہ اُس کے لطف و ذوق کو دوبالا کر دینا، ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ازل میں یہ نعمت اکبر کے لیے مقسوم ہو چکی تھی۔ فرماتے ہیں، اور کس بے تکلفی کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

اس عہد میں شاعر کے لیے قوت نہیں ہے — اِس باغ میں طوطی کے لیے توت نہیں ہے

نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا — سائنس سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے

لفظوں ہی کے چکر میں ہیں اب افعلن و فعلن — چرخا ہی چلا جاتا ہے اور سُوت نہیں ہے

نیچر ہی کا مطبخ ہے بہت معتبر اکبر — تم دیکھتے ہو پھل میں کہیں چھوت نہیں ہے

(اکبر کا مقام تو تصوف و الٰہیات کا "لاہوت" ہے، لیکن جب قافیۂ بیجان کے "ناسوت" میں اُترتے ہیں، تو دیکھنے والوں کو "مبہوت" کر دیتے ہیں۔ مزید توصیف سے "سکوت" ہی اولیٰ ہے۔)

خالص عاشقانہ رنگ کے شیدائی، شاید اپنے ذوق کی تسکین کا کچھ سامان ان غزلوں میں پا سکیں ؎

عشق کہتا ہے بیانِ حال کی پروا نہ کر — تیرے دل کی خود بخود اُن کو خبر ہو جائیگی

---

[1] کلیات میں یہ مصرعہ یوں طبع ہوا ہے ع شیخ جی ضبط کریں ہم تو پیے لیتے ہیں
راقم موصوف نے اسے اس طرح پر درج کیا ہے جس طرح اکبر مرحوم کی زبان سے سنا تھا۔

مجھ کو اک حیرت ہے اپنے شوق کی اُمید پہ ۔۔۔ کیا نگاہِ قہر اُلفت کی نظر ہو جائیگی
ہیں شبِ فرقت میں تڑپوں اور وہ سوئیں چین سے ۔۔۔ کس طرح مانوں محبت بے اثر ہو جائیگی

تجھے اے اُمیدِ فردا دل و جاں سے پیار کرتے ۔۔۔ مگر اپنی زندگی کا نہیں اعتبار کرتے
ہے بتوں کی خود نمائی مری غفلتوں سے قائم ۔۔۔ میں اگر نظر نہ کرتا تو وہ کیوں سنگار کرتے
لیا ہم نے بوسۂ رُخ تو نہ بدگماں ہوا اے جاں ۔۔۔ کوئی پھول دیکھ لیتے تو اسے بھی پیار کرتے
ترے ہاتھوں کی یہ زینت تو ہے شاخِ گل سے افزوں ۔۔۔ ہمیں دسترس جو ہوتا تو گلے کا ہار کرتے

کتمانِ رازِ عشق مرے آب و گل میں ہے ۔۔۔ خاموش ہے زبان جو کچھ ہے وہ دل میں ہے
افعیِ زُلف مس کا تو سودا اُبرا نہیں ۔۔۔ پیچیدگی جو کچھ ہے فقط اُس کے بل میں ہے

(لکھنؤ کے قدیم مذاقِ سخن کے دلدادہ "سودا" اور "بل" کی تو شاید زیادہ قدر نہ کریں، البتہ "افعی" "زلف" "پیچیدگی" اور "بل" کی مناسبتوں پر تو "لوٹ لوٹ" جائینگے - ایسے ہی اشعار کی توصیف و تحسین میں "دفتر کے دفتر" سیاہ کر دیتے ہیں - ایک ایک لفظ کی مو بمو تشریح کرتے ہیں، اور "سلسلۂ بیان کو" "برہم" نہیں ہونے دیتے)

صبر رہ جاتا ہے اور عشق کی چل جاتی ہے ۔۔۔ ضبط کرتا ہوں مگر آہ نکل جاتی ہے
کچھ نتیجہ نہ سہی عشق کی اُمیدوں کا ۔۔۔ دل تو بڑھتا ہے طبیعت تو بہل جاتی ہے
شمع کے بزم میں جلنے کا جو کچھ ہو انجام ۔۔۔ مگر اس عزم سے سانچے میں تو ڈھل جاتی ہے
وعدۂ بوسۂ ابرو کا نہ کر غیر سے ذکر ۔۔۔ دل لگی میں کبھی تلوار بھی چل جاتی ہے

کوئی کوئی اس رنگ کا بھی شعر فرما گئے ہیں، جو اُستاد امانت کی روح کو وجد میں لے آئے، مثلاً ؂

اُس سرو قد پہ آکے بلا مدت سے مر رہا ہوں
اللہ راست لائے کوشش تو کر رہا ہوں

لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں عموماً وہی کہتے ہیں، جو دل میں محسوس کر چکے ہوتے ہیں - ان کی شاعری اکھاڑہ کا کرتب

نہیں، واردات قلب کا عکس ہے۔ جو گزرتی ہے، وہی دوسروں کے سامنے برملا کہہ گزرتے ہیں۔ خود بھی اپنے اس ہنر سے واقف ہیں، اور اعتراف کرتے ہیں کہ بجز اس ایک بات کے اور میرے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں ؎

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اپنے میں اور رسمی شاعروں میں جو فرق پایا، اسے بھی صاف صاف بیان کر دیا ہے ؎

میں اپنے آپ میں، اُن شاعروں میں فرق پاتا ہوں
سخن اُن سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں

حضرت اکبر کے آخری دَور تغزل کا کافی نمونہ دکھایا جا چکا (ضمناً دَورِ ابتدائی و متوسط کے کلام سے بھی تعارف ہو گیا)۔ حق یہ ہے کہ اکبر کی عظمت ان کے عاشقانہ کلام کی بنا پر نہیں، بلکہ دوسرے اصنافِ سخن پر ہے۔ عشقیہ شاعری (خصوصاً آخری دَور کی) اس جہانِ سخن کی قلمرو کا خام ترین علاقہ ہے، اور اگر محض اس صنف کلام کے معیار پر فیصلہ کیا جائے، تو اکبر کی کرسیِ امتیاز کو اُس کے موجودہ مقام سے پیچھے ہٹانا پڑیگا۔ بایں ہمہ خالص تغزل میں بھی ان کا مرتبہ اُردو شعرا میں صرف چند ہی سے فروتر ہے۔ روزمرہ کی شیرینی اور زبان کی صفائی میں ان کی اکثر غزلوں پر داغ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، اور عاشقانہ تخیل کی بلند پروازیوں میں اگر وہ عموماً غالب کی فضا تک نہیں پہنچ سکتے ہیں تو بھی اکثر مقامات پر انھیں شیفتہ و آتش کے بازوؤں سے بازو ملائے ہوئے پرواز کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ ابتدائی اور درمیانی ادوار میں اس کی مثالیں بکثرت ملینگی۔ آخری دور میں کمتر۔

(د) اخلاق و معاشرت

اکبر کے صحیفۂ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق و معاشرت ہے۔ ان کی شاعری کی روح ان کی اخلاقی و معاشری تعلیمات ہیں۔ ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں، آخری دَور میں تصوّف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے۔ لیکن دو چیزیں ایسی تھیں، جنھوں نے اوّل سے آخر تک کبھی ساتھ نہ چھوڑا، بلکہ ہر دَور میں رفاقت قایم رکھی۔ ایک ظرافت جس کا تعلق پیرایۂ ادا و انداز بیان سے تھا۔ دوسرے اِصلاح معاشرت و تزکیۂ اخلاق جس کا تعلق موضوع سخن و مفہوم

کلام سے تھا۔

اکبر کی شاعری کے نمود ترقی کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی کا ربع آخر، اور بیسویں صدی کا خمس اول ہے۔ یہی زمانہ ہندوستان میں مغربی تمدن، مغربی اخلاق، مغربی معاشرت، غرض مغربیت کے انتہائی عروج و شیوع کا ہے۔ اکبر جب دنیا سے روشناس ہوتے ہیں، تو ان کے ملک و قوم کی حالت یہ ہے، کہ غدر ۱۸۵۷ء کو فرو ہوئے چند سال گزر چکے ہیں، ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلط کے شکنجہ میں پوری طرح کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامت اعمال کے نتائج بھگت رہی ہے۔ اسلامی اخلاق، اسلامی ادب، اسلامی شعائر، مدت ہوئی رخصت ہو چکے ہیں۔ ثروت و خوشحالی کا اول تو وجود ہی عنقا ہو رہا ہے، اور پھر جو کچھ ہے بھی وہ عیاشیوں اور نفس پرستیوں کے لئے وقف ہے۔ تعلیم و تربیت، اتحاد و اتفاق، نظم و انتظام، ضبط و خودداری، ہمت و بلند نظری، صداقت و حق پرستی، قناعت و ایثار، میں سے کوئی ایک شے موجود نہیں۔ عقاید میں تزلزل آچکا ہے، ایمان کی مضبوطی ایک افسانۂ پارینہ رہ گئی ہے، حرص و طمع، مکر و نفاق، خود غرضی و غداری، نفس پروری و عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ داد خواہی کے لئے انگریزی عدالتیں ہیں، تعلیم کے لیے انگریزی مدرسے ہیں، سفر کے لئے انگریزی سواریاں ہیں، علاج کے لئے انگریزی شفاخانے ہیں، رسل و رسائل کے لئے انگریزی ڈاک خانے ہیں، مہاجنی کے لئے انگریزی کوٹھیاں اور بنک ہیں، ماضی سے واقفیت کے لئے انگریزوں کی کتابیں ہیں، حال سے باخبر رہنے کے لئے انگریزوں کے اخبارات ہیں، مستقبل کی پیشینگوئی کے لیے انگریزی سائنس ہے، عزت و حکومت کے لئے انگریزی عہدے ہیں، حصول زر کے لئے انگریزی پیشے (بیرسٹری و کالت، ڈاکٹری، انجنیری وغیرہ) ہیں، زینت و آرائش کے لیے انگریزی مصنوعات اور انگریزی بازار ہیں، نشاط و تفریح کے لئے انگریزی پارک اور انگریزی تماشہ (تھیٹر وغیرہ) ہیں۔ غرض جس طرف بھی رخ پھرتا، حد نظر تک ایک غیر محدود نامتناہی پرچم انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا۔

اپنی اس پستی اور ان کی اس بلندی، اپنی خاک نشینی اور ان کی فلک پروازی کو دیکھ کر بعض نیک نیت ہمدردان قوم کی، جن کی آنکھیں اس جگمگاہٹ سے خیرہ ہو چکی تھیں، یہ رائے ہوئی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنی دنیا "ان" کی تقلید میں درست کرلی جائے، دنیا ٹھیک ہو جائے، تو دین بھی درست ہو جائیگا، ڈوبتے ہوئے شخص کو جان بچانے کے لئے گھاس کے تنکے کا سہارا کافی نظر آتا ہے، تاریکی اور ویرانہ میں انسان کو اپنے سایہ پر بھوت کا گمان ہوتا ہے، سوتے ہوئے شخص

کے کمرہ میں دفعتہً تیز روشنی کر دی جائے تو ذرہ سمجھے گا کہ آفتاب نکل آیا۔ یہی حال اُس وقت قوم کا تھا۔ اضطرار قلب انتشار خاطر، اختلال حواس، و اجتماع حوادث کے وقت دیو میں پری کا حُسن و جمال معلوم ہوا، عجوزۂ ہفتاد سالہ پر نازنین شانزدہ سالہ کا دُھوکا ہوا، دیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگا۔

اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا۔ علم و فضل کا معیار کمال یہ قرار پایا کہ انگریزی زبان آجائے۔ تلفظ انگریزوں کا سا ہو جائے اور انگریزی علوم سے واقفیت ہو جائے۔ تہذیب و شایستگی کی معراج یہ ٹھیری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے۔ لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں خاندان مشترکہ کے وجود کو ذلیل سمجھکر ضعیف والدین اور دوسرے اعزہ سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ شرافت و عزت کا منتہائے خیال یہ قایم ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہدے حاصل کئے جائیں۔ انگریزی حکومت کی برکات کا وعظ کہا جائے اور اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں کو نقصان پہونچا کر انگریزی دربار میں رُسوخ حاصل کیا جائے۔ عقل و دانش کا مفہوم یہ قرار پایا کہ ہر انگریزی مُصنّف کے ہر قول پر بے چون و چرا ایمان لے آیا جائے، انگریزی قانون، انگریزی فلسفہ، انگریزی سائنس کو ہر قسم کی تنقید و تنقیح سے ماورا سمجھ لیا جائے اور اپنے علوم و فنون اپنے شعایر و رسوم، اپنے عقائد و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دیکر انگریزیت کے صنم دل رُبا کے قدموں پر نثار کر دیا جائے۔ اُردو زبان اس لئے حقیر نظر آنے لگی کہ یہ "سرکار" کی زبان نہیں۔ پردہ کی رسم اس لئے غلامی نسواں کی مرادف معلوم ہونے لگی کہ انگریزی خواتین کا شعار بے حجابی کا ہے۔ تعدد ازدواج کا دستور اس لئے شرمناک محسوس ہونے لگا کہ انگریزی قوم ایک سے زائد منکوحہ بیویاں رکھنے کے ضابطہ سے ناآشنا ہی۔ عرش کے انکار پر سب سے قوی دلیل یہ قایم ہوئی کہ انگریزی ہیئت و جغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں، شیاطین، جنّات و ملائکہ کے وجود کے ابطال کے لئے یہ دلیل قطعی نکلی کہ انگریزی سائنس کسی آلہ کی مدد سے ان کا مشاہدہ نہ کرسکا۔ معجزات کا دعویٰ اس لئے قابل مضحکہ ٹھیرا کہ مل و اسپنسر ان کے قایل نہیں۔ نبوّت و الوہیت کے عقاید میں اس لئے رخنے پڑنے لگے کہ ہکسلی و ہیوم متشکک رہے ہیں۔

غرض فرش سے لے کر عرش تک، ذرہ سے لے کر آفتاب تک، کوئی شے ایسی نہ تھی جو اصنام مغربی کا کلمہ نہ پڑھنے لگی ہو۔ ساری فضا مغربیت کے زہر سے مسموم ہو چکی تھی۔ "اقبال سرکار" "عقل فرنگ" "دانایان مغرب" جیسے فقرہ، جو اسی دَورِ مرعوبیت کی یادگار ہیں، حقایق متعارفہ کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے تھے۔ دُنیا کی

تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہ تھا۔ سنت الٰہی ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ جب کسی قوم کی بداعمالیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں اور نورِ ایمان ماند پڑ چکتا ہے، تو اُس کی آنکھوں کو عیب، ہنر کی۔ ظلمت، نور کی اور زخم، مرہم کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ زَیَّنَّا لَہُمۡ اَعۡمَالَہُمۡ فَہُمۡ یَعۡمَہُوۡنَ (نمل رکوع ۱) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کی نظر میں ہم انھیں کے اعمال بد کو خوشنما کر دکھاتے ہیں، اور وہ اسی میں پڑے بھٹکتے رہتے ہیں۔

اِن بدبختیوں پر یہ لعنت بھی شروع ہی سے مسلط رہی ہے کہ مادّیت و دُنیا پرستی میں منہمک ہو کر اُن لوگوں کا مضحکہ کرتے رہتے ہیں، جن کی روش ہدایت، نیک کاری و تقویٰ کی ہوتی ہے۔

زُیِّنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا وَ یَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (بقر رع ۲۶) کافروں کی نظر میں حیات دنیوی خوشنما کر کے دکھادی جاتی ہے، اور یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ مضحکہ کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستان کے مُسلمانوں پر (اور ایک حد تک دوسری قوموں پر بھی) پوری طرح یہی شامتیں اور بدبختیاں مسلّط تھیں۔ نام نہاد مصلحین خود خواب غفلت میں مست تھے۔ سر سیّد اور اِن کے انصار و رفقاء خواب دیکھتے دیکھتے صدا لگاتے کہ "جس حد تک ممکن ہو، انگریز بن جاؤ" مولانا حالیؔ درمیان میں چند لمحوں کے لئے آنکھیں ملتے ہوئے کلمۂ شہادت پڑھنے لگتے ہیں، لیکن ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے پھر تھپکیاں دے کر سُلا دیتے ہیں، اور آس پاس کے سونے والوں کے ہم آواز ہو کر وہ بھی خواب میں بڑانے لگتے ہیں۔ مولانا شبلیؔ بظاہر یورپ کے مدِّمقابل بن کر اکھاڑے میں اُترے اور نادیدہ حریف کے پینترے بدل بدل کر خوب خوب وار کئے، لیکن حالت یہ رہی کہ اُدھر کسی نے حریف کی آمد کا نام لیا اور اُدھر پٹا ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ قیاس ہوتا ہے کہ مولانا بھی ساری عمر مصروفِ خواب ہی رہے، بعض خواب ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان اُٹھ کر چلتا پھرتا اور سارے کام کاج کرتا ہے لیکن پھر بھی سوتا ہی رہتا ہے اور اس کی تمام حرکات بیداری کی نہیں بلکہ نوم ہی کی ماتحتی میں انجام پاتی رہتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شاید مولوی صاحب موصوف کی بھی رہی۔

بہرحال یہ فضا تھی جس میں اکبر نے اپنی آنکھیں کھولیں، یہ ماحول تھا جس میں انھیں اپنا پیام پہنچانا تھا۔ وہ رسمی شاعر نہ تھے، قافیہ پیمائی اِن کا مطمحِ نظر نہ تھا۔ مشاعروں کے لئے طرحی غزلیں تیار کرنا ان کا جوہرِ کمال نہ تھا۔ وہ ایک

خاص مقصدِ حیات لے کر آئے تھے۔ ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا بوجھ ان کے شانہ پر تھا۔ فطرت کی جانب سے وہ ایک رسول[1] ہو کر آئے تھے۔ ان کا پیام اسی تحریک مغربیت کے خلاف ردِّ عمل تھا۔ ان کی شاعری اوّل سے آخر تک اسی مادّیت و مغرب پرستی کا جواب ہے۔ ان کے ترکش کا ایک ایک تیر اسی ہدف پر آ کر گرتا ہے۔ ان کے فلسفہ، اُن کی ظرافت، اِن کی سیاسیات کے دائرہ کی معمولی پیمایش بھی ممکن نہیں، تا وقتیکہ اس مرکزی نقطہ پر نظر نہ قایم رکھی جائے۔

یہ رنگ موجود شروع سے تھا، رفتہ رفتہ اس میں ارتقا ہوتا رہا، یہاں تک کہ آخر زمانہ میں ہر سانس سے یہی نغمہ پیدا ہونے لگا تھا۔ عورتوں کی پردہ دری کے متعلق اُن کا یہ مشہور و معروف قطعہ بہت قدیم ہے ؎

آئیں جو بے حجاب نظر چند بیویاں　　　اکبرؔ زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

قوم کی موجودہ حالت انتشار جو خود اپنی ہی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے، اس کا نقشہ بھی بہت مدّت ہوئی جب ان کے قلم نے کھینچا تھا ؎

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا　　　چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبرؔ　　　اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

کلیات سوم میں اصلاح معاشرت، تزکیۂ اخلاق، احیاء شعایر اسلامی، و تجدید تہذیب مشرقی کا وعظ سطر سطر میں ملتا ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ مولانا حالیؔ کی طرح اکبرؔ نرے واعظ نہیں۔ وہ پہلے شاعر ہیں۔ پھر واعظ پہلے ظریف ہیں۔ پھر معلّم اخلاق، پہلے نقاش فطرت ہیں، پھر مُصلح معاشرت۔ ان کی مجلس میں جام شراب کا دَور چلتا ہے یخنی کے پیالے تقسیم نہیں ہوتے[2]۔ یہ اور بات ہے کہ حلق سے اُتارنے کے بعد وہ شراب، شراب طہور ثابت ہو۔ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ۝

---

[1] ”رسول“ بمعنی قاصد، سفیر یا پیمبر یہ توضیح اُن حضرات کے ”بپاس خاطر“ ضروری سمجھی گئی جو بنگال دریا دلی قادائے کفر کی تقسیم فرماتے رہتے ہیں۔ راقم مضمون کو اس تقسیم سے بہت بڑا حصّہ مل چکا ہے اور اس کے ساتھ میں اڈیٹر صاحب اُردو بھی محروم نہیں رہے ہیں۔
[2] اکبرؔ نے خود ایک جگہ اس خیال کو نظم کیا ہے کہ ”لوگ مجھ میں اور مولانا حالی میں فرق دریافت کرتے ہیں۔ میں جواب دیتا ہوں کہ شراب اور یخنی کا موازنہ نہ ہی کیا“۔ افسوس ہے کہ وہ اشعار حافظہ میں نہ رہے اور کسی مطبوعہ کلیات میں موجود نہیں۔

یاد ہوگا کہ اکبرؔ سے کچھ قبل بنگال کا ایک نامور فرزند بنکم چندر چٹرجی بھی یہی مشن لے کر پیدا ہوا تھا۔ تہذیب جدید کے خطرات کا اس نے بھی پوری طرح اندازہ کر لیا تھا، اور بنگالی زبان میں اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ سے اِس سیلاب کے روکنے کی اپنے امکان بھر کوشش کی۔ بنکم نے اپنا حربہ نثر کی شمشیرِ عُریاں کو رکھا۔ اکبر نے اِس کے بجائے نظم کے نشتر کو اختیار کیا۔ بنکمؔ کی تلوار کا کاٹ سب نے دیکھا اور اکثروں نے شاباش اور واہ واہ سے ہمّت افزائی بھی کی۔ اکبرؔ کا نشتر عموماً زیرِ آستیں رہا اور لوگوں کی نظر سے مخفی۔ البتہ اس کی گدگدی اس غضب کی تھی کہ بسمل بجائے کراہنے اور تڑپنے کے اکثر فرطِ انبساط سے لوٹنے لگتا۔

جدید تہذیب و تمدن کا ایک بہت بڑا مظہر آزادیِ نسواں ہے۔ اس شاندار لفظ کے عقب میں حقیقت عریانی بے پردگی، بے حجابی، و بے عصمتی کی ہے۔ اکبرؔ کے ترکش کے اکثر تیروں کا ہدف یہی ہے۔

اس تہذیب کا ایک نمایاں کرشمہ یہ ہے کہ جہاں بیوی سے شرم و حیا رخصت ہو چکتی ہے، وہاں شوہر سے بھی حمیّت و غیرت سلب ہو جاتی ہے۔ اکبرؔ کے نگارخانہ میں یہ مرقع ایک ممتاز مقام پر آویزاں ملے گا ؎

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں حجاب اُن کو نہیں آتا، انھیں غصّہ نہیں آتا

یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق جس افراط سے دائر ہوتے رہتے ہیں اور ان کے دَوران میں جن حیا سوز واقعات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے، وہاں کے اخبارات جس کثرت سے اور جس لطف و ذوق کے ساتھ اسرارِ خانگی کو طشت از بام کرتے رہتے ہیں، وہاں کے ادنیٰ نہیں بلکہ متوسط و اعلیٰ طبقات میں بھی ازدواجی زندگی جن دشواریوں، تلخیوں اور حرماں نصیبیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے، یہ سب آزادیِ نسواں کی برکات ہیں۔ سرکارِ انگریزی کے طفیل میں ہندوستان بھی ان برکات سے مستفید ہو چلا ہے۔ اب یہاں بھی ایسے واقعات معدوم نہیں رہے ہیں۔ لیکن ابھی چوں کہ احساسِ حمیّت و غیرت بالکل مُردہ نہیں ہو گیا ہے، اس لئے وقوعِ واقعہ کے بعد کثیر صورتیں تاسف ندامت کی بھی رُونما ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کیفیت اکبرؔ کی زبان سے سنئے ؎

کیا گزری جو اک پردے کے عدو رو رو کے پولس سے کہتے تھے عزّت بھی گئی دولت بھی گئی بیوی بھی گئی زیور بھی گیا

اِس غزل کے اور جو چند شعر ہیں درد و عبرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں، اس لئے اگر انھیں بھی یہاں سنا دیا جائے، تو شاید زیادہ بے محل نہ ہو ؎

اکبرؔ نہ تھا بُت خانہ میں زحمت بھی ہوئی اور زر بھی گیا — کچھ نامِ خدا سے اُنس بھی تھا کچھ ظلم بتاں سہی ڈر بھی گیا

پروانہ کا حال اس محفل میں ہی قابلِ رشک ای اہلِ نظر — اِک شب ہی میں یہ پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہُوا اور مر بھی گیا

کعبہ سے جو بُت نکلے بھی تو کیا کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل — افسوس کہ بُت بھی ہم سے چھٹے اور چھوٹے خدا کا گھر بھی گیا

جو گونج رہا تھا خوشیوں سے اُس قصر پہ کل رُویا میں بہت — کوئی مُتنفس تھا نہ وہاں اندر بھی پھرا باہر بھی گیا[1]

کیا گزری جو الخ

ایک جگہ بے پردگی اور "تعلیم نسواں" کے تلازم پر کتنا لطیف شاعرانہ استدلال کیا ہی ؎

مجلسِ نسواں میں دیکھو عزّتِ تعلیم کو — پردہ اُٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

یہ شاعرانہ تخیل اس واقعیت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہی کہ پردہ شکن گروہ کی طرف سی بڑی دلیل یہی پیش کی جاتی ہی کہ پردہ کی چار دیواری میں رہ کر علم کی تازہ ہَوا نصیب ہونا ممکن نہیں۔ اور علم و تعلیم کا جو مفہوم اس گروہ کے ذہن میں ہی اُس کے لحاظ سے یہ قول ہے بھی بالکل بجا۔

مشرق میں بہترین عورت کا تخیل یہ تھا کہ گھر کی اندرونی زندگی کی مالک ہو، خانہ داری کا اعلیٰ سلیقہ رکھتی ہو، بچپن میں والدین کی اطاعت اپنے لئے باعث شرف سمجھے، اور نکاح کے بعد شوہر کی خوشنودی کو پروانۂ جنت خیال کرے۔ نظام خانگی اس کی ذات سے درست رہی خاندان کی مسرّتیں اس کے دم سے قایم رہیں اور اولاد کو تربیت کے بہتر راستہ پر ڈال سکے۔ شوہر کی عزّت و محبّت، بڑوں کی تعظیم و خدمت گزاری اور چھوٹوں کی اُلفت و شفقت کے جذبات لے کر دُنیا میں آنکھ کھولے، اور انھیں جذبات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔ مغرب میں عورت کا معیار عزّت اس سے بالکل مختلف ہی۔ اس کے نزدیک عورت کا یہ مشرقی تخیل عورت کے لئے باعث توہین و تحقیر ہی۔ فرہنگ مغرب میں الفاظ اطاعت و خدمت گزاری محکومی و غلامی کے مرادف ہیں۔ فرنگیوں کا قول ہی کہ عورت اطاعت کے لئے نہیں حکومت کے لئے آئی ہی۔ اِس کا کام یہ نہیں کہ گھر کے اندر پڑی سڑا کرے،

---

[1] اِس شعر کا تعلق اکبرؔ کی آپ بیتی ہی ہے۔ اِن کی کوٹھی عشرت منزل (الٰہ آباد) آج سے پچیس[2] تیس سال اُدھر حقیقۃً عشرت منزل تھی۔ ہر روز دعوتیں ہر شب جلسہ، ہر وقت چہل پہل ہنسی مذاق۔ سامان آرایش، فرنیچر، وغیرہ سب اعلیٰ درجہ کا۔ آخر زمانہ میں اُس کے بالکل برعکس حالت تھی پائیں باغ ویران، مکان سُنسان، اسباب نمایش آرایش غائب ہر طرف سنّاٹا چھایا ہُوا۔ ایک خود حضرت اکبر ایک ملازم اور ایک بوڑھی ماما۔ کُل آبادی اِس قدر رہ گئی تھی۔

اور ہر وقت شوہر ہی کے پاس گھُٹ گھُٹ کر رہا کرے، بہترین عورت وہ ہے جس کے حسنِ گفتار، حسنِ رفتار، حسنِ صورت، حسنِ صوت، باکمال رقص کے کارنامے منظرِ عام پر آتے رہیں، جس کے فوٹو اخبارات میں شائع ہوتے رہیں اور جس کا تذکرہ زبانوں میں حلاوت اور جس کا نظارہ آنکھوں میں تراوت پیدا کرتا رہے۔ بہترین عورت وہ نہیں جو شوہر کی بہترین مونس و غمگسار ہو، بلکہ وہ ہے جس کی زندہ دلی، جس کی زمزمہ سنجی، جس کی نفاست و شائستگی اور جس کی رعنائی و دلربائی کے نقوش ہر کلب کے در و دیوار، ہر پارک کے سبزہ زار، اور ہر ہوٹل کے فرنیچر پر ثبت ہوں۔

"ہمارے" اور "ان کے" اس فرقِ تخیل کو اقلیم الفاظ و معانی کا یہ تاجدار صرف دو لفظوں میں جس جامعیت جس صداقت اور جس بلاغت کے ساتھ بیان کر جاتا ہے یہ اسی کا حصّہ تھا ؎

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

"چمکی" میں جو بلاغت ہے اس کا لطف اردو کا زباندان ہی لے سکتا ہے۔ یہ چمک مخصوص نئی روشنی کا فیض ہے۔ پرانے چراغوں کی روشنی میں چمک دمک کہاں۔ شرم و حیا کا دور ہونا، اکتسابِ ہنر دنیا کی ملستانی کی غرض سے کرنا، اپنے تئیں فیشن کے سانچہ میں ڈھالنا، یہ سارا مفہوم اور اس سے بہت کچھ زائد "چمکی" کے لفظ سے ادا ہو جاتا ہے۔ اور "شمعِ انجمن" "چراغِ خانہ" کی تشبیہات تو اس قدر چست ہیں کہ ان سے روشن تر تشبیہ خیال میں بھی نہیں آتی۔

ہم اب تک اُن کی کم سخنی و بے زبانی پر مفتوں تھے اور اپنی خانہ آبادی کی تمنا میں تھے، اب جو جا کر دیکھتے ہیں تو وہاں محفل طرازی و بزم نوازی کے ٹھاٹھ جم رہے ہیں اور گلے بازی کی مشق ہو رہی ہے ہم پر اس کایا پلٹ سے عبرت، حسرت و حیرت کے مشترک جذبات طاری ہوتے ہیں اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ یا الٰہی یہ کیسی قلب ماہیت ہو گئی، کل تک ہم جسے نقشِ تصویر سمجھ رہے تھے، وہ آج گراموفون بنا ہوا ہے ؎

خامشی سے نہ تعلّق ہے نہ تمکین کا ذوق
اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں
بُت جو تھے دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھے مصرعہ کی بلاغت پر دفتر کے دفتر قربان ہیں۔ تیسرا مصرعہ اس پہلو کی جانب رہنمائی کر رہا ہے کہ یہ تغیر جو کچھ

ہوا ہی تغیر ماحول کا نتیجہ ہے۔ جب مادیت، ظاہر پرستی اور نمود و نمایش سے ساری فضا مملو ہوگئی، اور مردوں کی نظر میں آسایش پر آرایش، راحت پر لذت، اور تسکین پر ہیجان مقدم ہوگیا تو عورتوں کے لئے بھی سوا اس کے چارہ نہ رہا، کہ وہ بھی زمانہ کا ساتھ دیں۔

ایک اور مقام پر مشرق و مغرب کے تخیل عزت نسوانی کے فرق کو، جو نظام تعلیم کے بدل جانے سے لازمی طور پر پیدا ہوگیا ہی۔ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

اعزاز بڑھ گیا ہی، آرام گھٹ گیا ہی — خدمت میں ہی وہ لیسٹ[1] اور ناچ کو ریڈی[2]

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بیوی، پبلک پسند لیڈی

اسلام نے پردہ کے بارہ میں جو انتہائی سختی برتی ہی۔ اس کی بنیاد نفس بشری کی انتہائی کمزوری پر ہی جو گروہ نکاح کو ایک بے معنی رسم قرار دیتا ہی اُس کی جانب روئے سخن نہیں، لیکن جن رگوں میں ابھی مشرقی خون دَوڑ رہا ہی اور جو لوگ بلا واسطۂ نکاح تعلق ازدواجی کے ایک عمل شیطانی ہونے کے قایل ہیں ان سے عرض ہی کہ انسان کسی وقت بھی اپنے نفس کی جانب سے مطمئن نہیں ہوسکتا، بڑے بڑے پاکباز مرد و عورت کے بھی بہ حالت تخلیہ ملنے جلنے میں یہ خطرہ پوری طور پر باقی رہتا ہی کہ ممکن ہے جذبات حیوانی دفعتہً ہیجان میں آجائیں۔ شریعت اسلام نے نفس بشری کی اس نفسیاتی (سائیکو لاجیکل) حقیقت کو ملحوظ رکھکر محض زناکاری کو حرام نہیں قرار دیا ہی بلکہ ان حالات و اسباب کو بھی ناجائز قرار دیا ہی جو اس نتیجہ کی جانب لے جانے میں معین ہوتے ہیں۔ کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہی۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا۔ محض اتنا نہیں کہ زناکاری نہ کرو بلکہ یہ کہ زناکاری کے قریب نہ جاؤ۔ پردہ کا رواج جو مسلمانوں میں پڑا۔ اس کی بنیاد اسی حکیمانہ مصلحت پر ہی۔ ایک اور موقع پر کلام پاک میں بصیغۂ امر مسلمان مردوں اور عورتوں دونوں کو حکم ملتا ہی کہ "اپنی اپنی نظریں نیچی رکھیں" یہ ساری احتیاطیں اور قیدیں اس واسطہ ہیں کہ بدکاری کے جتنے راستہ ہیں سب مسدود ہوجائیں۔ مغرب نے اس سیلاب کو تعلیم کے بند سے روکنا چاہا۔ اس میں اس کو جیسی کچھ کامیابی ہوئی وہ ہر محرم اسرار پر ظاہر ہے۔ اور یہی ہونا بھی چاہیئے تھا شیطان کو جو شے دور رکھنے والی ہی وہ نور ایمان ہے، نہ کہ کتابوں کے انبار، رسائل اخبار، اور کالجوں کے در و دیوار

---

[1] سست کاہل۔ [2] آمادہ۔ تیار۔

جن کے مجموعہ پر آج تعلیم کا اطلاق ہوتا ہے۔ اکبرؔ اس کیفیت کی نقاشی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ برادران کالج ذرا جارج ایلیٹ کی دماغی عظمت اور لوئیس و اسپنسر کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کو ایک بار پیش نظر کریں ۔

میں بھی گریجوئیٹ ہوں تو بھی گریجوئیٹ　　علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آ کے لیٹ
دونوں نے پاس کر لئے ہیں سخت امتحاں　　ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگماں
بولی یہ سچ ہے علم بڑھا جہل گھٹ گیا　　لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا

یہ سب کچھ سچ ہے، مگر پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ پردہ کے احکام تو مسلمان عورت کے لئے ہیں، جب سرے سے اسلام ہی غائب ہے تو پردہ کی پابندی کیسی اور بے پردگی میں مضایقہ کیا ؟ پردہ تو بقائے ناموس و لفظ ایمان کی غرض سے ہے جب ناموس و ایمان عنقا ہیں تو ان کے تحفظ کی تدابیر بے معنی ہیں۔ خورد و نوش زندہ جسم کی ضروریات کے لئے ہے، لیکن جب زندگی جسم سے مفارقت کر چکتی ہے تو مُردہ جسم کو کوئی نہیں کھلاتا پلاتا۔ صندوق میں بڑے بڑے مضبوط قفل اُس وقت تک پڑے رہتے ہیں، جب تک اس میں زر و جواہر محفوظ ہیں، لیکن جب وہ خالی ہو جاتا ہے تو کوئی بھی اس کی حفاظت کی فکر نہیں کرتا۔ پھولوں کی قدر اسی وقت تک ہے، جب تک ان میں نازکی و خوشبو باقی ہے۔ باسی اور خشک پھولوں کو کون گلے کا ہار بنانا پسند کرے گا؛

فرماتے ہیں ۔

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید　　بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے
نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ　　شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

عقبیٰ و دین کے خیال سے قطع نظر کیجئے۔ محض مادّی و دنیوی نقطۂ نظر سے دیکھئے کہ مشرقی خواتین کو مغربی تعلیم دینے کا اب تک نتیجہ کیا نکلا ہے ؟ لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھتے چلئے کہ خود ہمارے مردوں نے شکسپیر ملٹن کی ورق گردانی اور مِل و اسپنسر پر دماغ سوزی کر کے اب تک بجز چند نوکریوں کے اور کیا حاصل کیا؟ جب ہی تو یارانِ طریقت کا کہنا یہ ہے کہ ۔

شیخ صاحب ہی کا ہی بزم میں کیا رُعب و وقار — کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی اُمید

خیر، مردوں کی تعلیم کا تذکرہ تو اصل موضوع سے دُور کر دے گا، عورتوں کی مغربی تعلیم کا نتیجہ اب تک تو یہی دیکھنے میں آیا ہی کہ میم صاحبہ کے بچّوں کے کھلانے کے لئے آیاؤں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہی۔ کُلیّات اوّل میں فرماتے ہیں ؎

ترقی کی نئیں ہم پر چڑھائیں — گھٹا کی دولت آپس میں بڑھائیں
رہیں ہر پھر کے آیا بی نصیبن — وہ گو اسکول میں برسوں پڑھائیں

کُلیّات سوم میں اس مرقع کو زیادہ آب و رنگ دے کر پیش کرتے ہیں ؎

اِک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو اُبھارا — اِک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

. . . .

کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے بال میں رقصاں — باقی جو تھے گھر اُن کا تھا افلاس کا مارا
ہر زادہ بنا کمپ میں، یہ بن گئیں آیا — بی بی نہ رہیں جب تو میاں پن بھی سدھارا
دونوں جو کبھی ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرع — آغاز سے بدتر ہے سرانجام ہمارا

عجلت پسند طبائع یہ نتیجہ نہ نکال بیٹھیں کہ اکبر سرے سے تعلیم نسوانی کے مخالف تھے اور لڑکیوں کے بالکل ہی ناخواندہ و جاہل رکھنے کے حامی تھے۔ وہ تعلیم نسواں کے پورے ہمدرد تھے، لیکن اُس تعلیم کے جو قوم میں رابعہ بصریہ و جہاں آرا بیگم کے نمونہ پیدا کرے، نہ اُس تعلیم کے جس کو ملکہ کلیوپٹرا، میڈم ڈی اسٹیل، ماڈالین و جارج ایلیٹ پر فخر ہو۔ وہ اُس تعلیم کی ترویج کے آرزومند تھے جو مہربان مائیں، وفا سرشت بیویاں اور اطاعت شعار لڑکیاں پیدا کرے، نہ اُس تعلیم کی جو تھیٹر میں ایکٹری اور برہنہ رقاصی[1] کے کمالات کی جانب لے جائے۔ وہ

---

[1] یہ مفروضات و تخیلات نہیں، واقعات و مشاہدات ہیں ۱۳ء میں مِس ماڈالین صاحبہ ہندوستان تشریف لائی تھیں، جن کا نام یورپ و امریکہ میں بچہ بچہ کی زبان پر تھا، اور ہندوستان کے انگریزی اخبارات کے کالم ان کے کارناموں سے لبریز ہوتے تھے، ان کا کمال یہ تھا کہ نہایت باریک لباس میں جو جسم کے صرف نصف حصہ کا ساتر ہوتا تھا، اسٹیج پر تشریف لاتی تھیں، اور حالت رقص میں بالکل برہنہ ہوجاتی تھیں لیکن جسم اس تیزی سے گردش کرتا رہتا تھا کہ ناظرین کی نگاہ جسم کے کسی حصہ پر ٹھہر نہیں پاتی تھی راقم مضمون نے لکھنؤ کے انگریزی ناچ گھر (رنگ تھیٹر) میں یہ تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لکھنؤ کے شوقین تماشائی اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے دُوربینیں لیکر گئے تھے!

ملک میں حوریں پیدا کرنا چاہتے تھے کہ دُنیا جنت بن جائے۔ پریوں کے مشتاق نہ تھے کہ ہندوستان راجہ اندر کا دربار بن جائے۔ ان کا قول تھا ؎

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اس مقصد کی مزید توضیح سُنیئے ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
اُستاد ایسے ہوں، مگر اُستادجی نہ ہوں

("اُستادجی" اربابِ نشاط کے تعلیم دینے والوں کو کہتے ہیں)

ایک طویل نظم میں اپنا پورا مسلک وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے (صفحہ ۱۶۰ تا صفحہ ۱۶۲) چند شعروں سے اندازہ ہو سکے گا ؎

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

حُسنِ معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بیشک قصور ہے

لیکن ضروری ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت

آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت
ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت

ہر چند ہو علومِ ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مُرید تو بچّوں کی خادمہ

عصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے
اور حسنِ عاقبت کی ہمیشہ دُعا کرے

آگے چل کر حساب کتاب، نوشت و خواند، اصول حفظ صحت، کھانا پکانے، کپڑے سینے، وغیرہ کو درسِ نسوانی کا لازمی نصاب بتا کر آخر میں فرماتے ہیں ؎

داتا نے دھن دیا ہی تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

دُنیا میں لذتیں ہیں نمایش ہے شان ہے
ان کی طلب ہیں، حرص ہیں، سارا جہان ہے

اکبؔر سے یہ سنو کہ جو اس کا بیان ہے
دُنیا کی زندگی فقط اِک امتحان ہے

حد سے جو بڑھ گیا تو ہی اُس کا عمل خراب "آج" اُس کا خوشنما ہے مگر ہوگا "کل" خراب

فرماتے یہ سب کچھ تھے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتے تھے کہ رفتارِ زمانہ کا رُخ پھیرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، فطرت ہر صورت میں اپنا کورس پورا کر کے رہتی ہے۔ انبیاء کرام جو محض ہدایت خلق کے لئے مبعوث ہوتے تھے۔ عموماً ناکام ہی رہا کئے۔ صرف ایک محدود جماعت اِن پر ایمان لائی۔ باقی خوشحال و متمدن آبادی اُن کو ساحر یا مجنون (موجودہ اصطلاح میں Reactionary) سمجھ کر بدستور اپنے راستہ پر چلتی رہی، تاآں کہ عذابِ الٰہی نے اُس تمدن ہی کو اس حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ فنا کر دیا، جس کی چشم دید مثال حال میں شہنشاہیت روس کی معدومیت نے پیش کر دی ہے۔ حضرت اکبرؔ بھی اپنے مشن کی کامیابی سے مایوس تھے اور بارہا اس کا اظہار فرمایا ہے۔

کلیات دوم میں ایک قطعہ میں آزادیِ نسواں کے مستقبل کا نہایت دلکش مرقع کھینچتے ہیں۔ اس میں فرماتے ہیں کہ ضبطِ نفس و تقویٰ و ایمان رکھنے والوں کا دَور ختم ہو چکا ہے، اب کالج کے نوجوانوں کا دَور دَورہ ہے ؏

اُٹھ گئے وہ جنھیں مقدور تھا خودداری کا نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم نہ وہ دل کی امید
ولولہ لے کے نکلنے لگے کالج سے جواں شرمِ مشرق کے عدو شیوۂ مغرب کے شہید

کرکٹ فیلڈ ان کی مسجد ہے، اور تھیٹر ہال ان کی عیدگاہ ہے۔ اس تمدن کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ:—

بحث میں آ ہی گیا فلسفۂ شرم و حجاب دَورِ گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

عورتوں کو سیاسی حقوق مل گئے، اور مردوں کے دوش بدوش وہ پبلک میں کام کرنے لگیں ؏

زہرہ ممبر ہوئیں ووٹر تھیں جنابِ خورشید

اکبرؔ کے کچھ ہم خیال ابھی زندہ تھے۔ انھوں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ یہ کارروائی حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے بھی کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتی، لڑکوں کو مغربی تعلیم دلا کر کیا مفید نتائج نکلے ہیں جو اب لڑکیوں کو اس راہ پر ڈالا جا رہا ہے ؏

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

یہ کہنا تھا کہ روشن خیال و متمدن دنیا بے صبری کے ساتھ چیخ اُٹھی۔ ؏

نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند

اور تو اور بن بیاہی لڑکیاں تک جو "دولھا بھائی" کی روشن خیالیوں سے متاثر ہو چکی تھیں، مطالبہ حقوق کے لئے بیباکانہ آگے بڑھیں اور رجز خوانی کی بجلیاں گرانے لگیں ؎

لڑکیاں بول اُٹھیں خود بہ طریق تائید

دولھا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ — ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہیں — ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

ضعیف القویٰ، ضعیف العقل، ضعیف الحواس شیخ صاحب اس حملہ کی تاب نہ لا سکے، بھاگ کر اپنے حجرہ میں پناہ لی ؎

اکبر افسردہ شد از گرمیِ ایں طرز سخن — شیخ بگریخت و در صومعۂ خویش خزید

جدید پارٹی کو فتح کامل نصیب ہوئی، تالیوں کا شور بلند ہوا، اور فرزندانِ آدم و دختران حوا دونوں نے مل کر تہنیت حصول آزادی کا ترانا گایا ؎

کھُل گیا در نہ رہا شاہد مشرق کو حجاب — غل مچا "ہرے" کا بول اُٹھے یہ مغرب کے خرید

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست — آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

ایک قدیم غزل اسی مسئلہ حریت نسواں سے متعلق ہے ؎

بٹھائی جائیں گی پردہ میں بیبیاں کب تک — بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

جو مُنہ دکھائی کی ہے رسم پر مصرا بلیس — تو مُنہ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کب تک

مقطع میں انجام کی پیشینگوئی ہے ؎

سُنا ہے حضرتِ اکبر ہیں حامیِ پردہ — مگر وہ کب تک اور اُن کی رُباعیاں کب تک

عصمت و عفت، شرم و حجاب، چوں کہ مشرقی اخلاق و اسلامی تہذیب کا ممتاز و لطیف جوہر ہے، اس لئے اس کی تائید و حمایت میں اکبر نے بہت زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن حریت نسواں کے علاوہ بھی تمدن جدید کے جتنے نمایاں مظاہر ہیں تقریباً ان سب پر انھوں نے کم و بیش توجہ کی ہے۔ عبرت پزیری اُن کے قلب کا، اور

عبرت آموزی اُن کے قلم کا جوہر ہی۔ اِس ایک قوت کے سہارے ہر تختۂ زمین میں نئے نئے شگوفے کھلائے ہیں، اور ہر ریگستان کو لالہ زار بناتے چلے گئے ہیں۔

آج کل کے کمیٹی ساز اور جلسہ باز حضرات طلبِ دُنیا میں جس قدر منہمک اور روحانیت سے جس قدر بیگانہ ونا مانوس ہیں اُس کا عکس اکبرؔ کے جام جم میں دیکھنا ؎

جن میں ہر گام پہ اک دام بلا ہی درپیش ۔۔۔ نفس کو تو انھیں باتوں میں مزا آتا ہی

اِس کمیٹی میں نہیں رُوح کی لذت کا خیال ۔۔۔ ممبر اُٹھ جاتے ہیں جب ذکرِ خدا آتا ہی

اِس وقت خلوص کا نام بھی نہیں باقی رہا ہی، اتحاد کی بنیاد تمامتر خود غرضی رہ گئی ہے۔ انگریز اگر ایک زمانہ میں مُسلمان رعایا کے ہمدرد تھے تو محض اِس لئے کہ ان کی تائید حاصل کرکے ہندو رعایا کو زیادہ آسانی سے نقصان پہونچا سکیں، ہندو اور مُسلمان اگر آج متحد نظر آرہے ہیں، تو اس لئے نہیں کہ اتحاد و اتفاق بذات خود کوئی قابل قدر شئی ہے، بلکہ محض اس لئے کہ دونوں مل کر انگریزوں کو زک پہونچائیں۔ روس و انگلستان کی رقابت ایک زمانہ میں ضرب المثل تھی، دورانِ جنگ میں جرمنی کی قوت شکست کرنے پر دونوں دوست ہو گئے، اب پھر ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ جاپان کل تک روس کا دشمن تھا، آج امریکہ کے مقابلہ میں روس سے معاہدۂ اتحاد کر رہا ہی۔ اٹلی کل ترکوں کے خون کا پیاسا تھا، آج انگلستان کی ضد پر اُس کا ساتھ دینے پر تُلا ہوا ہے غرض تمدن جدید میں خالص دوستی ایک لفظ بے معنی رہ گیا ہی اغراض و مصالح کے تغیر کے ساتھ دوستی و دشمنی میں بھی ہر ساعت تغیر ہوتے رہنا ممکن ہی۔ اسلامی شاعر کو یہ منظر عبرت دیکھکر اپنے ہاں کا بھولا ہوا اصول اَلحُبُّ لِلّٰہِ وَالبغض لِلّٰہِ یاد پڑ جاتا ہی اور اِس کے مُنہ سے یہ نالہ موزوں نکلتا ہی ؎

اب تو یاری کا اِسی پر رہ گیا ہے انحصار ۔۔۔ جس کا تو حاسد ہے اُس کا جو ہو حاسد تیرا یار

واسطے اللہ کے ہو دوستی وہ اب کہاں

جنگ جب تک تھی بُتوں سے نام تھا اللہ کا ۔۔۔ اب تو ہر اک ہی مُجاور اِک جُدا درگاہ کا

واسطے اللہ کے ہو دوستی وہ اب کہاں

ہاں تجارت اور پالیٹکس میں دیکھیں جو سود ۔۔۔ چند روزہ متفق ہوں ورنہ اے شیخ وہنود

واسطے اللہ کے ہو دوستی وہ اب کہاں

۱۹۱۰ء؁ میں کلمہ گویان طریقت و مدعیان شریعت کے درمیان ایک سخت جنگ چھڑی۔ لاہور والے شریعت کے میدان میں مجاہدین کی حیثیت سے تکبیر کہتے ہوئے آئے۔ دہلی والے طریقت کی خانقاہ کو اپنا اسلحہ خانہ بنا کر نعرہ بلند کرنے لگے۔ اخباری شمشیر زنی ہوئی، رسالوں کی چاندماری رہی یہاں تک کہ گورنمنٹ سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ مصالحت دشوار تھی، ایک فریق کو اپنی جسمانی شہزوری پر دعویٰ تھا، دوسرے کو اپنے داؤں پیچ پر۔ اکبرؔ نے عین اُس وقت جب کہ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے مصلحت سمجھی و مصالحت جوئی کا دھارا کھول دیا۔ وہ آگ تو دیر یا سویر بجھنے والی تھی ہی۔ اب اس کی خاکستر بھی باقی نہیں البتہ چشمۂ اصلاح کے وہ قطرے یادگار رہ گئے جو کبھی خشک ہونے والے نہیں۔ پوری نظم طویل ہے، اقتباس ملاحظہ ہو ؎

اس وقت مولویت صوفی سے بھڑ گئی ہے	اغیار کو ہو مژدہ آپس میں چھڑ گئی ہے
مُلّا کو زعم ہے یہ دانم چرا نہ گویم	صوفی کو یہ کہ دارم پائے چرا نہ پویم
مُلّا یہ کہہ رہے ہیں میرا رسالہ دیکھو	صوفی کا ہے اشارہ میرا پیالہ دیکھو
مُلّا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے پڑھیئے	صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھیئے
کہتے ہیں کر رہی ہیں ہم یہ رفارمیشن	دیکھا نہیں تھا لیکن مُردوں پہ آپریشن
اس وقت کیا تمہاری یہ خوش خیالیاں ہیں	آپس میں گالیاں ہیں غیروں کی تالیاں ہیں
شیعہ ہوں خواہ سنی، مُلّا ہوں خواہ صوفی	بیسود جنگ باہم ہے سخت بیوقوفی
دیکھو زرا تنزل تو خود ہی زد پر ہے	موقوف کب یہ حالت آپس کے شور پر ہے
وقت نزاع باہم ہرگز نہیں ہے یارو	اللہ کو پکارو اللہ کو پکارو

سب سے گہرا دام لفظ "ترقی" میں مضمر ہے۔ مغرب کے معائب ہم جو کچھ بھی اختیار کرتے جاتے ہیں اگر انھیں معائب سمجھ لیں تو پھر ان سے بچنے کی بھی کوئی صورت نکال سکتے ہیں، لیکن ستم یہ ہے کہ انھیں بجائے معائب کے مناقب، بجائے نقایص کے کمالات، بجائے زہر کے تریاق سمجھ رہے ہیں "ترقی"، "تہذیب"، "شایستگی"

"ارتقاء" "روشن خیالی" وغیرہ چند الفاظ شیطان کان میں پھونک گیا ہے اور ہم بغیر ان کے مفہوم پر غور کئے اندھا دھندان کی تحصیل و تکمیل میں مصروف ہیں شیطان کی ذہانت کی داد دینی چاہیئے، کہ اس نے شکار کرنے کی ترکیب خوب نکالی ہے

شیطان نے ترکیب تنزل یہ نکالی — ان لوگوں کو تم شوق ترقی کا دلا دو

شیر کا شکار کرنا جب مقصود ہوتا ہے۔ تو درختوں میں بھینسے باندھ جاتے ہیں۔ شیر اُن کی بُو پاکر انھیں نوش جان کرنے آتا ہے اور بجائے اس کے خود ہی لقمۂ اجل ہو جاتا ہے۔ شاعر اس تشبیہ کو بھی کام میں لاتا ہے

شیرانِ شرق کا انھیں منظور ہے شکار — بھینسے بندھے ہوئے ہیں ترقی کے شوق کے

توسیع حقوق سیاسی پر ہم مسرور ہیں کہ اپنے نمایندوں کا حق انتخاب مل جانے سے ہماری آزادی میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن یہ نہیں غور کرتے کہ اس طرز انتخاب نے ہماری جماعت میں باہمی رشک وحسد، بدگمانی ونفسانیت خودغرضی ونااتفاقی کو کتنا بڑھا دیا ہے اور ناجائز ترغیبات کا دامن ہمارے نفس کے لئے کتنا وسیع کر دیا ہے۔ عذاب اُخروی سے اگر انکار ہے تو رہنے دیجئے، مگر خدارا یہ تو دیکھئے کہ اس طرز تمدّن سے عذاب دنیوی کیسا ہمارے سروں پر مسلط ہو گیا ہے

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے — خدا کی مار ہے ووٹوں کی مار کم کیا ہے

اسی راگ کو ایک دوسری دُھن میں سُنئے

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا — اچھے اچھے ہیں ووٹ کے شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ — سمجھیں ہیں اس کو فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی — سیلف گورمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی — ووٹ کی دُھن میں بن گئے پھرکی

موجودہ نظام تمدّن کا یہ طبعی اقتضا ہے کہ انسان حقوق والدین، حقوق بزرگان، حقوق خالق، سب سے بیگانہ ہو

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا ان کو کام — ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

شعر کے مضمون کو مُبالغۂ شاعری نہ سمجھا چشم عبرت اپنے گرد وپیش بارہا اس قسم کے مناظر دیکھ رہی ہے۔
آخرت کے خیال سے قطع نظر کیجئے۔ یہ فرمایئے کہ تہذیب جدید نے زیست کی سہولتوں پر کیا اثر ڈالا ہے؟ جنگ وہلاکت وسفّاکی کے وہ محیر العقول آلات و وسایل کس نے ایجاد کئے ہیں، جن تک چنگیز و ہلاکو کا وہم و گمان بھی نہیں پہنچ سکتا تھا؟ موٹروں، ریلوے ٹرینوں، ٹراموے وغیرہ کے ذریعہ سے اموات ناگہانی کا اَوسط ہر متمدن ملک میں کتنا بڑھ گیا ہے؟ ضروریات زندگی کی اس فوق الحد گرانی کی کوئی مثال پچھلی تاریخ میں ملتی ہے؟ ملوں کی کثرت، کارخانوں کی افراط اور ہر شعبہ میں بجائے قدرتی کے مصنوعی طرز معاشرت اختیار کر لینے سے بڑے بڑے متمدن شہروں کی صحت کا کیا حال ہوگیا ہے؟ متمدن آبادیوں میں فی صدی کتنے اشخاص کے دانت اور آنکھیں تندرستی کی حالت میں ہیں؟ جو سکون، اطمینان وانبساط خاطر بیگانۂ تمدن، دیہاتیوں کو حاصل رہتا ہے، اس کا عشرِ عشیر بھی تمدن جدید کے پُر آشوب ہنگامہ پرور وہیجان آفریں مرکزوں میں رہنے والوں کو نصیب ہوتا ہے؟ اس قسم کے بیسیوں اور سوالات پیدا ہوسکتے ہیں جن کو اکبرؔ کی ترجمان حقیقت زبان ان الفاظ میں ادا کرتی ہے ؎

تہذیبِ نو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبرؔ	دُنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو	کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گزر رہی ہے
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد	کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

سُنتے آئے ہیں کہ ہر درد کی دَوا علم ہے۔ خاک سے پاک کرنا علم کا کام ہے۔ محتاج کو غنی کرنا علم کا فیض ہے بیمار کو تندرست کرنا علم کی مسیحائی ہے۔ ایسا ہوتا ہوگا، لیکن ہم اپنے نصیب کو کیا کہکر روئیں کہ ہمارے لئے یہی تریاق زہر ہے۔ ہمیں جس علم سے سابقہ پڑا ہے، وہی ہمارے امراض کا مورث، ہمارے مفاسد کی اصل اور ہماری بدبختیوں کا منبع ہے۔ ہم جسے شربت سمجھ رہے ہیں، وہ جام زہر ہے، جسے رہبر سے موسوم کر رہے ہیں وہ رہزن ہے جس پر مسیح ہونے کا گمان کر رہے ہیں وہ فرشتۂ اجل ہے! جس نظام کو ہم نے علم وتعلیم کا نام دے رکھا ہے، درحقیقت وہ عین جہالت ہے۔ جس حکمت ودانائی کی ہم قصیدہ خوانی کر رہے ہیں وہ بیدانشی وجہل کی انتہا ہے۔ جس شے کو ہم نور وہدایت خیال کرکے خوش ہورہے ہیں، وہ ظلمت وضلالت کی آخری حد ہے۔ یہ وہی علم ہے جس کا مقصود

ہمارے دلوں میں حُبّ دنیا کو مستحکم کرتا ہے۔ یہ وہی تعلیم ہے جس کے نصاب میں خیال عقبیٰ و آخرت کے لئے کوئی جگہ نہیں، یہ وہی فلسفہ ہے جو خدا و رسول کے اعتقاد سے ناآشنا ہے، یہ وہی سائنس ہے جو مادّیات کے ماورا کسی عالم کا قایل نہیں۔ یہ وہی حکمت ہے جس کے ہاں جنّت دوزخ، حور و ملک کا وجود اوہام سے زاید کوئی مرتبہ نہیں رکھتا۔ اس نظام تعلیم کے جو نتایج ہونا تھے وہ ہو کر رہے۔ جو لوگ اس نظام تعلیم کے موئد ہیں اور پھر اس کے لازمی نتایج پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، اس خیال میں لگے ہوئے ہیں کہ آگ تو پیدا ہو جائے لیکن اس میں جلانے کی قوّت نہ ہو، پانی موجود ہو جائے، لیکن کسی شے کو تر نہ کر سکے، آفتاب نکل آئے لیکن کوئی شے اس سے منوّر نہ ہونے پائے۔ اکبرؔ کی تشخیص میں ہمارے انحطاط اخلاق، سوءِ معاشرت کا سبب وحید یہی مسموم نظام تعلیم ہے ؎

اِک علم تو ہے بُت بننے کا، اِک علم ہے حق پر مٹنے کا
اِس علم کی سب دیتے ہیں سند۔ اُس علم میں ماہر کون کرے

جب علم ہی عاشقِ دُنیا ہو پھر کون بتائے راہِ خُدا
جب خضر اقامت پر ہوں فدا، تائیدِ مسافر کون کرے

سودا بھی ہے رنگِ طبع بشر، فطرت ہی میں ہیں اسباب جنوں
اکبرؔ کو بھی ہوش آجائے تو پھر اس کام کو آخر کون کرے

ایک دوسرے مقام پر یہ حقیقت اور بھی واضح کردی ہے ؎

مسٹر نقلی کو عقبےٰ میں سزا کیسی ملی
شرح اس کی نامناسب ہے بلا جیسی ملی

اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس
چارہ کیا تھا اے خدا تعلیم ہی ایسی ملی

ایک اور جگہ ایک جدید اسلوب بیان اختیار کیا ہے ؎

اُس چیز کا کیا کہنا اکبرؔ، تھا جس نے دلوں کو نیک کیا
لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا، ہموار کیا اور ایک کیا

جو قوم کو ابتر کرتے ہیں، اب اُن اثروں پر رُونا ہے
معلوم نہیں کیا مطلب ہے، معلوم نہیں کیا ہونا ہے

. . . .

اس کا جو سبب ہے سُن لو اُسے سب پردہ عیاں ہے ظاہر ہے
الفاظ صریح و واضح ہیں، یہ مطلع اکبرؔ حاضر ہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

قوم کی شیرازہ بندی اگر مقصود ہے تو علی گڑھ، پشاور، لاہور و اٹاوہ اس درد کی دوا نہیں ہوسکتی ملازمت

کے سکون کی ٹکسالیں بیشک یہاں پیدا ہو سکتی ہیں لیکن "قوم" جس شے سے عبارت ہے، اس کا قوام تو دیوبند فرنگی محل، نظامیہ وعالیہ ہی میں ان کی موجودہ خامیوں کو دور کرنے کے بعد تیار ہو سکتا ہے۔ اس خوان کو ظرافت کے چٹخارہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں ؎

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی — عربی میں نظم ملت، بی اے میں صرف روٹی
لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے — بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے — کس کی نظر ہے غائر کس کی نظر ہے موٹی

لیکن "نظم ملت" کی اب پرواہ کس کو ہے۔ یہ تخیل کہ قوم میں اب دوبارہ (سلمان و بلال کا ذکر نہیں) غزالی و رازی، مالک وابو حنیفہ، سعدی و رومی پیدا ہوں، ممکن ہے کسی زبان پر اب بھی آجاتا ہو، لیکن دلوں سے مدت ہوئی مٹ چکا ہے۔ اب تو سب کی آنکھیں اس پر لگی ہوئی ہیں کہ ہمارے ہاں بھی نپولین، ولسن، بسمارک و گلیڈ اسٹن، راک فیلر و کارنیگی پیدا ہونے لگیں۔ خودی کی پرستش سے کس کو فرصت ہے، جو خدا کی پرستش پر توجہ کرے۔ شاعر بھی منظر دیکھکر صدا لگاتا ہے ؎

مذہب نے پکارا اے اکبر، اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں — یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

کائنات میں مادیت وتکلیف کا وجود اس غرض سے رکھا گیا ہے کہ اس سے نفس میں شکستگی و تضرع پیدا ہو اور اس وقت مخلوق اپنے ہمجنسوں سے بے آس ہو کر خلوص وخضوع کے ساتھ اپنے خالق کی جانب رجوع کرے اسلام میں عذاب الٰہی کا یہ فلسفہ تصریح و تکرار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ یہ ارشاد ہے کہ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ (انعام۔ ۵)

"اے پیمبر، تمہارے قبل جو قومیں گزر چکی ہیں ان کی طرف بھی ہم نے پیمبر بھیجے تھے اور ان قوموں کو بھی عذاب و سختی میں مبتلا کیا تھا، تاکہ وہ ہمارے حضور میں گڑگڑائیں"

اسی طرح ایک اور مقام پر ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِىٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ (اعراف ۱۲)

جس بستی میں ہم نے اپنا پیمبر بھیجا (اور اس نے اس کا کہنا نہ مانا) تو وہاں کے باشندوں پر ہم نے عذاب و مصیبت کو مسلط کیا تاکہ وہ لوگ گڑگڑائیں۔

فطرتِ سلیم ایسے موقع پر راہ ہدایت پا جاتی ہے۔ لیکن ایسی مخلوق کی بھی کمی نہیں، جس کی شقاوت وفساد اس حد تک پہونچ چکی ہوتی ہے کہ اس کے لئے یہ تمام تازیانہ بے اثر رہتے ہیں۔ ہر تازہ نشان، ہر جدید آیتِ الٰہی ہر تنبیہ فطرت اس کی غفلت وجمود، الحاد وجحود میں اضافہ ہی کرتی رہتی ہے۔ ان کی شامت اعمال کے پاداش میں ہر تریاق ان کے حق میں زہر کا کام دینے لگتا ہے۔ کلام اقدس میں اس طبقۂ انسانی کا کثرت سے ذکر آیا ہے، مثلاً

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ (مائدہ - ۹)

"یہ قرآن، جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے، ضرور ان میں سے بہتیروں (کی بداعمالیوں کے پاداش میں ان کی) کی سرکشی وکفر میں زیادتی کا باعث ہو کر رہیگا"۔

یا یہ کہ

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا (انعام ۳)

اے پیمبر ان میں ایسے بھی ہیں کہ تمہاری باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں، لیکن ہم نے (ان کی زشتی اعمال کے پاداش میں) ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کان میں ٹھینٹ، کہ تمہاری بات نہ سمجھ سکیں۔ اور یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ ساری دُنیا کی بھی نشانیاں دیکھ لیں تاہم ایمان لانے والے نہیں۔

یا یہ کہ

وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَن قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ (یونس ۱۰)

جو لوگ ایمان لانے والے نہیں، ان کے لئے نشانیاں اور ڈراونیاں سب بیکار ہیں۔

اس بدبخت وحرماں نصیب طبقہ کی شناخت یہ ہے کہ ہجوم مصائب میں بھی اسے مادی اسباب پر تکیہ اور دنیوی وسایل پر بھروسا رہتا ہے، اور تضرع وتبتل کی کیفیت سے ایسی حالت میں بھی ناآشنا رہتا ہے، فاقہ کشی کے وقت وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا کا وعدہ یاد نہیں پڑتا۔ دست سوال زریں کلاہو کے سامنے دراز رہتا ہے اور پائے طلب بلند وعالی شان دفتروں کے گرد طواف کرنے میں خستہ ہوتا رہتا ہے۔ اشتداد مرض میں سورۂ یٰسین کی تلاوت کا خیال نہیں آتا۔ نگاہ تھرمامیٹر کے اتار چڑھاؤ اور اسپتال کی شیشیو پر جمی رہتی ہے۔ مرتے وقت اس کی فکر نہیں ہوتی کہ پرسش اعمال کی نازک گھڑی کیونکر ٹل سکے گی خبط یہ

سوار رہتا ہے کہ تاریخ وفات کن کن اخبارات میں شایع ہوگی۔ اکبرؔ کی زبان حقیقت ترجمان اس منظر میں نوحہ خوانی کرتی ہے، لیکن جانتے ہیں کہ یاران مجلس مرثیہ خوانی و عزاداری کے نام سے گریز کرتے ہیں، بزم میں اس شان سے قدم رکھتے ہیں کہ چہرہ پر ظرافت کا نقاب پڑا ہوا ہے، ہاتھ اور پیر تھرکنے میں مصروف ہیں نشاط و زندہ دلی کا ساز ہمراہ ہے، لیکن منہ سے درد و عبرت کی صدائیں نکل رہی ہیں اور زیرلب سوز و فغاں کے سُروں میں آواز آرہی ہے۔ بزم میں تماشائی زیادہ ہیں، اہلِ نظر چند۔[1] تماشائی یہ سوانگ دیکھکر تالیاں بجاتے ہیں، اور اہلِ نظر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں یہ منظر ملاحظہ ہو ؎

میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیویاں نکلیں ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں

دُعا مُنہ سے نہ نکلی، پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ہم کو

ستم یہ ہے کہ دن کو دن اور رات کو رات کہنا بھی ناممکن ہوگیا ہے، تاآں کہ انسان اس جرم کے پاداش میں اپنے تئیں دار و رسن کے لئے نہ سہی، زنجیرِ زنداں کے لئے تیار نہ کرلے۔ حق گوئی ہمیشہ دشوار رہی ہے موجودہ فضا میں دُشوار تر ہوگئی ہے۔ زندگی اگر آرام و عزت سے گزارنا ہے، تو اس حمام میں برہنہ ہوکر داخل ہونا چاہیئے، اسی رنگ میں خود بھی رنگ جانا چاہیئے اور حق و دیانت کے خیال کو پس پشت ڈال دینا چاہیئے ؎

جو چلے بت تو بچے رہے، جو کھڑی کی تو دھرے گئے یہ عجب عمل، یہ عجب اثر، یہ عجیب نقش بھرے گئے

جو ملول آئے وہ خوش گئے جو فسردہ آئے ہرے گئے تری بزم اکبرِؔ خوش بیاں ہے محل فرحتِ دوستاں

اس وقت تو حُبِّ جاہ، طلبِ دُنیا، و حرصِ مال و زر کا جن ہر سر پر سوار ہے، روحانیت الگ رہی عقلی ادبی اخلاقی مباحث پر بھی توجّہ کرنے کی کس کو فرصت ہے۔ غزالیؔ و رومیؔ تو الگ رہے، فردوسیؔ و غالبؔ، فارابیؔ و طوسیؔ کی تصانیف بھی ہم پر بار ہو رہی ہیں کہ ان کا مطالعہ جلب زر میں ہمیں ذرا بھی مُعین نہیں معلوم ہوتا ؎

سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض

صاحب کا کیا جواب تھا، بابو نے کیا کہا بہرِ خدا جناب یہ دیں ہم کو اطلاع

دُنیا میں نزاع و اختلاف کا سلسلہ شروع سے قایم ہے، لیکن پہلے جنگ و جدال کی بنیا دعموماً پاس عزت، حفظ

---

[1] اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی ۔ بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی (حالیؔ)

ناموس وتحفظ عقائد پر ہوتی تھی کہ یہ سب چیزیں خودداری کے پہلو کو لئے ہوئے ہیں، لیکن اب زرپرستی طبائع پر اس درجہ غالب آگئی ہے کہ خصومتوں کی بنیاد بھی تقریباً صرف یہی باقی رہ گئی ہے۔ تجارتی رقابت معاشی مسابقت نے ہر شعبۂ حیات کو گھیر رکھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہے اب تو جنگ حکم وتجارت کے واسطے　　مذہب کے واسطے نہ شرافت کے واسطے

تیار ہو رہا تھا میں جنت کے واسطے　　لے ہی گئے گھسیٹ کے مجھکو پریڈ پر

منافقت و مداہنت کا دور دورہ ہے۔ قوم، قوم کے جو نعرہ لگائے جاتے ہیں، اکثر یہ چوب حب جاہ ہی کے طبل پر پڑتی ہے۔ مقصود تمام کارروائیوں سے نمود و نمایش ہی ہوتی ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس اُدھر ہمیں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ راہِ خدا میں جو کچھ خرچ کرو، اِس کو اِس قدر اخفار کے ساتھ کرو، کہ ایک ہاتھ سے دو اور دوسرے کو خبر نہ ہو۔ اور جو کچھ بھی خیرات کرو، خالصۃً وجہ اللہ کرو، احسان رکھنے اور حق جتلانے کا خیال تک دل میں نہ آئے ورنہ سب کیا دھرا اکارت ہوگا، بلکہ نرمی کے ساتھ انکار معذرت کر دینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ بعد کو اپنا حق جتلایا جائے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ (بقرع ۳۶)　　مسلمانو، اپنے صدقات کو احسان رکھکر اور سائل کو تکلیف دے کر رائگاں نہ کرڈالو۔

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى (بقرع ۳۶)　　نرمی سے معذرت کر دینا اُس خیرات سے کہیں بہتر ہے جس کے پیچھے سائل کو تکلیف کا سامنا ہو۔

لیکن اب حالت یہ ہے کہ چندہ بعد کو دیا جاتا ہے اور اس کا اعلان پہلے کیا جاتا ہے، پلیٹ فارم پر بھی اور اخبارات کے ذریعہ سے بھی، بلکہ اکثر صورتوں میں تو اعلان ہی اعلان رہتا ہے ادائی کی نوبت بھی نہیں آتی اور پھر اس کار خیر سے مقصود کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ فلاں انجمن کی صدارت مل جائے، فلاں کمیٹی کا کوئی عہدہ مل جائے فلاں جماعت پر اپنا ایک حق واثر قایم ہوجائے، یا پھر یہ کہ چندہ کو کسی خطاب کی قیمت سمجھ لی جائے۔ شاعر اپنے چاروں طرف یہ سماں دیکھکر حسرت و یاس کی لَے میں پکار اُٹھتا ہے ؎

جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لئے　　کچھ دیکھتا نہیں میں دلِ زار کے لئے

ایک دوسری جگہ عبرت وحسرت کے اِس گنجینہ کو شوخی ظرافت کے دوشالہ میں ڈھانپ کر پیش کرتا ہے

چرخ نے پیش کش کہہ دیا اظہار میں   قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں   بیبیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

انتشار ملّت کی اِس سے صحیح تر تصویر اور کیا ہو سکتی ہے۔

حمایت مذہب کے دعوے آج بھی بہت کچھ کئے جاتے ہیں، لیکن معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ فلاں فریق کی مخالفت میں ہم اِس خیال کی حمایت کر رہے ہیں، نہ یہ کہ فی الواقع ہم اِس خیال کے ماننے والے ہیں۔ زید اپنے تئیں صوفی کہتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اشغال و اذکار صوفیہ کرام پر عامل ہے۔ بلکہ صرف اِس قدر کہ بکر کے غیر صوفیانہ عقاید پر معترض رہتا ہے، اخبارات میں اِس کی ذات کے خلاف مضامین لکھتا ہے اور ہر طرح اِس کی توہین و تذلیل کے درپے رہتا ہے۔ اسی طرح بکر اپنے تئیں خالص شریعت کا متبع بتاتا ہے، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ سنت نبویؐ پر عامل ہے بلکہ صرف یہ کہ زید پر طنز و تعریض کرتا ہے، اسے بدعتی قرار دے اور اس کے ساتھ دشمنی کا کوئی درجہ اُٹھا نہ رکھے۔ اکبرؔ کا قلم اس سادہ تصویر کو بلاغت کے رنگین نقوش کے اضافہ کے ساتھ یوں پیش کرتا ہے

ہادی کے کبھی پیرو نہ ہوئے ہاں اُن کے لئے لٹھ تان سکے   مذہب نے ہمیں پہچان لیا، ہم اس کو نہیں پہچان سکے

اِس خدا فراموش نظام معیشت اور اِس خود پرست آئین معاشرت کے اختیار کر لینے کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ اور صرف یہ کہ دلوں سے میل ملاپ کی خواہش اٹھ گئی، دُنیا سے صلح و سازگاری رخصت ہوگئی۔ امن و عافیت کا نشان نہ رہا، انبساط قلب و سکون خاطر کے الفاظ بے معنی رہ گئے، نظام مواخات و آئین ہمدردی کے بجائے "تنازع للبقاء" "کارزار" حیات کا فلسفہ رائج ہوگیا، ضروریات زندگی گراں ہوئیں، بدکاریاں ارزاں ہوئیں، ہلاکتیں بڑھیں، عمریں گھٹیں، ہیجان میں بیشی، اطمینان میں کمی آئی۔ محبتیں مٹیں، خصومتیں اُٹھیں۔ خدا فراموشی کا یہ نتیجہ ہونا ہی تھا کہ زندگی تلخ ہو جائے، یہ خبر صدیوں پیشتر دیدی گئی تھی کہ

مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ ۲) جو ہماری یاد سے روگرداں رہیگا، اس پر زندگی تنگ ہو کر رہیگی۔

"متمدن" طرز معاشرت سے عُقبیٰ جیسی سنورتی ہے اس کا حال تو بعد کو معلوم ہوگا، لیکن یہ تو مشاہدہ ہے کہ

دنیا بھی برباد ہو جاتی ہے۔ فطرت کا یہ پیام روزِ ازل سے ایسے لوگوں کے لئے موجود ہے کہ

فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (بقرہ ۱۰) — تم میں سے جو لوگ ایسا کریں۔ اُن کا بدلہ سوا اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی دُنیا خراب ہو اور ۔ ۔ ۔

یہ طریقِ معیشت، یہ فلسفۂ اخلاق دین و دُنیا دونوں کو برباد کر کے رہتا ہے۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (بقرہ ۱۴) — ایسوں کے لئے دُنیا میں بھی رُسوائی اور آخرت میں بھی عذاب شدید ہے۔

گلشنِ مشرق کا باغبان اپنی آنکھوں سے اپنے چمن کی بربادی دیکھتا ہے۔ اتنا بس نہیں کہ صیاد کا ہاتھ پکڑ سکے لیکن اپنے اوپر تو کسی حد تک اختیار اب بھی باقی ہے۔ زبان پر مرثیہ ہے لب پر آہ ہے۔ آستین آنکھوں پر ہے اسے ہٹا کر دیکھئے تو کچھ بوندیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ممکن ہے مستقبل کا جوہری ان موتیوں کی کچھ قیمت لگا سکے ؎

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں — باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں قومی ہے یا تنزل — گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں
ٹلنے وہ لگ رہے ہیں جو کروٹوں میں ٹوٹیں — بخیے جو فطرتی تھے وہ اب اُدھڑ رہے ہیں
سطحِ زمیں سے پوچھو کیا مل رہا ہے اس کو — نظروں میں پھل جھڑی ہے گو پھول جھڑ رہے ہیں
چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی — لیکن اُمید کیا ہو جب دل اُجڑ رہے ہیں
یہ زیورِ معانی کس کی کریں گے زینت — لفظوں کے یہ نگینے کیوں آپ جڑ رہے ہیں

آج ہر طرف سائنس کی ترقیوں کا شہرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلسفہ تو ظنیات و احتمالات کی بھول بھلیاں ہے لیکن سائنس قطعیات و یقینیات کا ہادی ہے۔ اور سائنٹیفک آلات و اختراعات کا وجود تمدن جدید کا مخصوص فیض ہے۔ لیکن اوّل تو مسائل سائنس کی قطعیت کا دعویٰ ہی سرتاسر بے بنیاد ہے۔ کوئی اہم سائنٹیفک مسئلہ ایسا نہیں جس پر شدید اختلاف آرا موجود نہ ہو۔ پھر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ آلات و اختراعات اب تک دُنیا کے لئے باعث برکت ثابت ہوئے ہیں یا موجب لعنت؟ ان سے مجموعاً اب تک دُنیا کے ذخیرہ مسرت و راحت میں اضافہ ہوا ہے یا حوادث قتل و غارت، جنگ و جدال، جراحت و ہلاکت میں؟ ان سے انسان کے جذبات ملکوتی کو زیادہ تحریک و تقویت پہونچی ہے، یا جذبات بہیمی کو؟ ان سوالات کے جوابات کے لئے "متمدن"

و ''غیر متمدن''، کی زندگیوں کا موازنہ کافی ہے۔ شاعر کے ذہن میں یہ سب واقعات ومشاہدات محفوظ ہیں۔ آہ سرد کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ اپنا اخلاق، اپنا ایمان، اپنا جوہر شرافت، سب ہم نے آپ کی خوشنودی پر نثار کر دیا تھا، اپنوں کو محض آپ کی خاطر بیگانہ کر لیا تھا، لیکن اب جو نظر پھیر کر دیکھتے ہیں تو آپ کی تشریف آوری سے مصائب میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اور اخلاقی پلہ روز بروز ہلکا ہی ہوتا چلا جاتا ہے ؎

مری عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں ۔۔۔ مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں
جو دیکھا سائنس کا یہ چکر دھرم پکارا کہ اے برادر ۔۔۔ ہماری دوری میں پُن مگن تھی، تمہاری دوری میں پاپ خوش ہیں

''ہمارا'' ''اُن کا''، مشرق ومغرب کا یہ جو اختلاف ہے، جزئیات میں نہیں، کلیات میں ہے، فروع میں نہیں، اصول میں ہے۔ عوارض میں نہیں، ذوات میں ہے۔ بخت واتفاق سے نہیں، جبلت وسرشت میں ہے۔ وہ مادیات میں مست ہیں، ہم روحانیات میں غرق۔ وہ ذہانت وتیز رفتاری، لذت وناموری کے بھوکے ہیں، ہم سنجیدگی وسلامت روی، راحت وگمنامی کے قدردان ہیں۔ وہ تجارت وثروت کی گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں، ہم فقر واستغنا کے حجرہ میں معتکف ہیں۔ ان پر حصول ممالک وخزاین کی دُھن سوار ہے ہم تسخیر قلوب ونفوس کے عمل میں مشغول ہیں۔ وہ دنیا سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہم خود اپنے نفس سے۔ انہیں اپنے کولمبس ونیوٹن، کوپرنیکس وگلیلو، ڈیکارٹ وکینٹ پر ناز ہے۔ ہمیں اپنے کرشن وگوتم بدھ، نانک وکبیرؒ، حضرت صدیقؓ وحضرت امیرؑ پر فخر ہے۔ وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے رہیں گے، ہم اپنے سفر میں کائنات مادی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہ انتہائے عقل وتحقیق میں یہ دریافت کر کے اُچھل پڑتے ہیں کہ ''انسان بندر ہے''، ہم انتہائی بدمستی وبیہوشی میں پکارنے لگتے ہیں کہ ''انسان خدا ہے''۔ اکبر اس دریا کو کوزہ میں بند کر کے پیش کرتے ہیں ؎

مشرقی کو ہے ذوق روحانی ۔۔۔ مغربی میں ہے میل جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں ۔۔۔ ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست ۔۔۔ ''فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست''

اکبر محض واعظ نہ تھے۔ حکیمِ اخلاق بھی تھے۔ راہِ راست کی جانب اشارہ کر کے خاموش ہو جانے

والے نہ تھے، بلکہ اس راستہ کی پیچیدگیوں اور سفر کی دقتوں سے بھی واقف تھے، اس لئے آیندہ مسافروں کو ان چیزوں کی بابت بھی ہدایات دیتے جاتے ہیں۔ اخلاق کے اکثر مسائل بہ غایت پیچیدہ واقع ہوئے ہیں، جذبات فطرت کی کشش ایک سمت ہوتی ہی، عاقبت اندیشی کا فتویٰ اس کے مخالف جانب ہوتا ہی۔ اکبرؔ نے جابجا ان گتھیوں کو بھی سُلجھایا ہی۔ ان کے کلام میں متعدد مقدمات ایسے آتے ہیں، جہاں اخلاق و معاشرت کے جزئیات نہیں، بلکہ فلسفۂ اخلاق کے اُصول کو بیان کیا ہیٔ اور مسائل اساسی کی عقدہ کشائی کی ہی۔

شباب کی بدمستیاں و بے احتیاطیاں جس غضب کی ہوتی ہیں، ہر شخص پر روشن ہیں۔ ساتھ ہی مذہب و اخلاق کے دارالافتاء سے ہر لغزش پر انتہائی تعزیر کی وعید موجود ہی۔ اکبرؔ اس مسئلہ سے متعلق پہلے حکیمانہ ژرف نگاہی کے ساتھ انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں، اور مرض کی ایک ایک علامت بیان کر جاتے ہیں، اُس کے بعد نسخۂ شفا تجویز کرتے ہیں یہ تشخیص اور یہ علاج اس قدر مکمل ہی کہ اس میں ایک حرف کی ترمیم و اضافہ کی گنجایش نہیں ارشاد ہوتا ہی ؎

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی اور نفس نے چاہا رشک پری
شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہی بجا، اور نفس کی خواہش بھی ہی روا
شیطان کا ساتھ البتہ بُرا، اور خوفِ خدا ہی اس کی دوا

بہت سے لوگ مذہب سے متعلق واقفیت و معلومات محض اس لئے حاصل کر رکھتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے ان کا اظہار کرتے رہیں، یا یہ کہ دوسروں کے افعال پر رائے زنی کرتے رہیں۔ خود ان معلومات پر عمل کرنا نہیں مقصود نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی زبانی واقفیت محض لاحاصل ہی۔ مذہب و اخلاق سے فائدہ اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہی جب ان کی تعلیمات پر عمل کر کے انھیں جزو زندگی بنا لیا جائے۔ نہ یہ کہ ان کے تذکرہ سے گرمیٔ محفل کا کام لیا جائے۔ لیکن عمل بغیر نفس کشی کے ممکن نہیں۔ نفس کو لذت تو صرف دوسروں کے بتانے میں آتی ہی ؎

علم دیں حاصل کیا، لیکن قباحت یہ ہوئی
صرف سکھلانے میں لذت ہی عمل میں کچھ نہیں
زیست کا مصرعہ بنے خود آہ سوزاں تب ہی لطف
ورنہ اے اکبرؔ تری نظم غزل میں کچھ نہیں

کسی مذہب کا نام لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل شی پاکیزگیٔ اخلاق ہی۔ کفر و ایمان مذہبی اصطلاحیں ہیں جو اخلاق حسنہ،

واخلاق سیئہ کے مُرادف ہیں۔ جو پاک طینت ہیں وہ مومن ہیں، جو بدطینت ہیں، کافر ہیں ؎

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں — جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں بُرے جو ہیں وہ کافر ہیں
وہی ہیں پاک طینت لو لگی ہے جن کی خالق سے — نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست بس وہ طاہر ہیں

موجودہ زمانہ میں مذہب کی سوشل حیثیت بہت اہم ہوگئی ہے۔ ایک شخص عیسائی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عیسائیوں سے میل جول رکھتا ہے، کھانے پینے رہنے سہنے کا طریق فرنگیوں کا سا رکھتا ہے "بڑے دن" کے روز خوشی مناتا ہے۔ اگر شیعہ ہے تو معنی یہ ہیں کہ محرّم میں مجلس کرتا ہے، ماتم میں شریک ہوتا ہے۔ تعزیہ رکھتا ہے، شیعہ سوسائٹی میں گھلا ملا رہتا ہے۔ اگر سُنی ہے تو معنی یہ ہیں کہ محفل میلاد کرتا رہتا ہے۔ صوفیہ کرام کی عظمت رکھتا ہے، اہل سُنّت کی تقریبات میں شریک رہتا ہے، اپنے گھر کی ریت رسم سُنیّوں کی سی رکھتا ہے۔ کسی شخص نے تبدیل مذہب کر دیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنی سوسائٹی بدل دی اور اپنے سوشل طریقوں میں تغیر کر دیا۔ نجات و نکال اُخروی کا تعلق صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہے، لیکن مذہب کی ظاہری ہیئت محض ایک معاشری و اخلاقی واقعہ ہے۔ اس لئے دُنیا کو یہ دیکھنے کی بالکل حاجت نہیں کہ فلاں کے معتقدات کیا ہیں، بلکہ دیکھنا صرف یہ چاہیے کہ اس کے اعمال و اخلاق کیسے ہیں ؎

مذہب ہے امر قومی، سمجھو نہ فعل ذاتی — معذور سب ہیں اس میں گنگو ہوں یا دفاتی
شیعہ ہوں خواہ سُنی لالہ ہوں یا برہمن — مذہب کو مورثوں سے سب پاتے ہیں عموماً
پولٹیکل ضرورت بیشک تھی اس کی اوّل — اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف سوشل
اچھا بُرا نہ کہہ دو تم مذہبی بنا پر — اخلاق اس کے دیکھو اصلی تو یہ ہے جوہر
تعلیم ہے جو عمدہ صحت اگر ہے اچھی — پا دو گے اس کو اچھا طینت اگر ہے اچھی
ناری ہے یا کہ ناجی، اس کا بیاں نہیں ہے — سوشل طریق یہ ہے اور وہ تو راز دیں ہے

قانون فطرت ایسا رکھا گیا ہے کہ ایک کے بڑھنے کے معنی دوسرے کے گھٹنے کے ہوتے ہیں۔ ایک شخص قمار بازی میں ہزار ہا روپیہ ہار بیٹھتا ہے اس کے گھر میں ماتم برپا ہوتا ہے لیکن جس شخص نے ہزار ہا روپیہ چند منٹ میں جیت لیے ہیں اس کے ہاں شادیانے بجتے ہوتے ہیں۔ پرانی آبادی کو ویران کر کے محکمۂ آرائش بلدہ

وہاں ایک خوشنما و خوش فضا پارک بنوا تا ہے، خلقت وہاں تفریح کے لئے اُمنڈ اُمنڈ کے جمع ہوتی ہے اور ہر وقت ہنستی بولتی ہستیوں کا مجمع لگا رہتا ہی۔ لیکن ادھر بھی کبھی خیال گیا ہے کہ کتنے مکانات مسمار ہو کر یہ قطعۂ زمیں پارک کے لئے نکلا ہی؟ اور اُن مکانات کے مکینوں کے دلوں پر اپنے پیارے گھروں کو چھوڑتے وقت اور انھیں منہدم ہوتے دیکھکر کیا کچھ گذری ہوگی! ایک فاتح اپنی فتحمندیوں کا جشن مناتا ہی، مگر یہ بھی کبھی یاد کرتا ہی کہ اِس کے باعث کتنے خاندان برباد، کتنے گھر بے چراغ، اور کتنے زندہ مُردہ ہو چکے ہیں! ؎

یہ بات ہی صاف مجھ سے سُن لی، کتاب میں اِس کو کیا پڑھیگا
حدودِ دُنیا کے ہیں مُعیّن جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھیگا

انسان معاصی سے دستکش عموماً اُسی وقت ہوتا ہی جب گناہوں کی قوت سلب ہو چکتی ہی۔ ورنہ جب تک قوت و سامان موجود ہی، نفس پرستیوں اور سیہ کاریوں کا سلسلہ موقوف نہیں ہوتا ؎

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہی
مگر اس بزم میں سچ ہے کہ "جی ہاں" ہی بہت

وعظِ تقویٰ نہ کہو رحم کرو اکبرؔ پر
چشم بد دور ابھی طاقتِ عصیاں ہی بہت

نیک کاری و بدکاری کا ایک عمدہ معیار یہ ہی کہ اوّل الذکر کے بعد طبیعت میں شگفتگی پائی جاتی ہے اور آخر الذکر کے بعد سعی و اخفا، جو بزدلی کے مرادف ہی ؎

شگفتہ پایا طبیعت کو بعدِ کارِ ثواب
دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

کتابی معلومات انسان کے جوہرِ باطن کو صیقل نہیں کر سکتے۔ اِس کے لئے اچھی صحبت ناگزیر ہی۔ عالم بے عمل یہی لوگ کہلاتے ہیں، جن کے دماغ کتابی معلومات سے لبریز ہیں، لیکن دل غفلت کی نیند سو رہے ہیں ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

جُستجو ہم کو آدمی کی ہے
وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں[1]

انسان کے خلاف مزاج دُنیا میں ہزارہا واقعات پیش آتے رہتے ہیں، لیکن کارخانۂ دہر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا اِس کے بس کی بات نہیں۔ اِس لئے مآل اندیشی کا تقاضا یہ ہی کہ انسان ہر نا ملایم واقعہ پر صبر و

---

[1] ایک اور موقع پر ؎

کام نکلے گا نہ اے دوست کتبخانوں سے
رہیئے کچھ روز کسی محرمِ اسرار کے ساتھ

تسلیم سے کام لے۔ انسان ناز اُسی سے کر سکتا ہے، جو اس کا نازبردار ہو۔ تمام موافق طبع وغیر موافق طبع حوادث پر صبر و تحمل کرنا۔ بہت کا لالچ نہ کرنا، کم کا غم نہ کرنا، یہی اصول ایسے ہیں جو زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دیں گے ؎

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیوں کر کروں | بےحد آتا ہے مجھے غصہ مگر کس پر کروں

چل بسے چھوٹے بڑے تھا جن سے لطفِ زندگی | مجھ پہ کس کو ناز ہے میں ناز اب کس پر کروں

وصل کی شب حسبِ موسم ہو ہی جائے گی بسر | لطف اُٹھاؤں یا درازی کی دعا شب بھر کروں

دور بے مہری اُمید محبت کس سے ہو | اُڑ رہی ہے خاک ہر سو کس کے دل میں گھر کروں

کائنات کا ذرّہ ذرّہ کسی خاص مصلحت کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔ ہر فعل کا ادنیٰ سے ادنیٰ کیوں نہ ہو معاوضہ کسی نہ کسی صورت سے مل کر رہیگا۔ انسان اگر اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور دل کو عیش و عشرت کے پھندے میں نہ پھنسنے دے تو زندگی بڑے امن و عافیت کے ساتھ گزر سکتی ہے۔ عام حیات میں تلخی پیدا کرنے والی ہماری ہی غفلت شعاریاں ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کو ایک مسلسل غزل میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

اکبر اس فطرتِ خاموش کو بےحس نہ سمجھ | ہاں بصیرت سے تہی دیدۂ نرگس نہ سمجھ

راحتِ زیست کے سامان سے دھوکے میں نہ آ | امتحاں گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ

جاہ و منصب میں نظر عاقبتِ کار پہ رکھ | خاتمہ جس کا ہو افسوس اسے آفس نہ سمجھ

صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حسنِ عمل | بہرِ انجام یہ امرت ہے اسے بس نہ سمجھ

دل کا دنیا کی اُمیدوں سے بہلنا ہے بُرا | زندگی تلخ کریں گی انھیں مونس نہ سمجھ

تعصب اور غصہ کے جذبات عموماً تنگ نظری کی بنا پر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کی نظر جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہے۔ نفرت و تعصب سے بھی نجات ملتی جاتی ہے۔ البتہ کارخانہ فطرت کی عظمت و تنوع کو دیکھکر حیرت طاری ہوتی رہتی ہے ؎

شیخ جی کی نظر میں ہیں ہوں فقط | میری نظروں میں ساری دنیا ہے

بس یہی وجہ ہے کہ اے اکبر | مجھکو حیرت ہے اُن کو غصہ ہے

علایق دنیوی کی کثرت ہمیشہ افزایش غم و الم کا سبب بنے گی۔ امن و عافیت مقصود ہے تو دنیوی تعلقات کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیئے ؎

ایک جمتا ہے ایک پگھلتا ہے — کام دنیا کا یونہی چلتا ہے
دل تعلق بڑھا کے پچھتایا — پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

انسان دوسرے کی عیب چینی و نقص جوئی میں تو بہت پیش پیش آتا رہتا ہے، لیکن خود اپنی کمزوریوں اور خطاکاریوں کی جانب کبھی بھولے سے بھی توجہ نہیں کرتا۔ اس کو کس پر لطف انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

میری نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سُنا — یہ تو کہیئے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

انسان کی نسبت سب سے زیادہ صحیح رائے خود اسی کا ضمیر قایم کر سکتا ہے کہ وہی اس کی اصلی کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے۔ انسان ساری دُنیا کو دھوکے میں ڈال سکتا ہے۔ لیکن خود اپنی ضمیر سے کوئی شے مخفی نہیں رکھ سکتا ؎

نہ پھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے — تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

محض گوشہ نشینی تزکیہ اخلاق کے لئے کافی نہیں، اصل شے قلب کی بے تعلقی ہے اور اس کا مدار عمل پر ہے۔ اچھی باتوں کے زبانی داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں، دل سے ماننے والے جو ان پر عمل کر دکھائیں بہت کم نکلتے ہیں ؎

حرص دُنیا سے نہیں ہر صاحب عزلت بری — خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کونا اور ہے
مدحتِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند — خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

نفس بشری کی ایک خاص کمزوری جو دنیا پر ہمیشہ سے مُسلط رہی ہے اور ابنائے عصر خصوصیت کے ساتھ جس کا شکار ہو رہے ہیں یہ ہے کہ انسان بدکاروں کی بدکاری پر انھیں بُرا بھلا کہہ لینا اپنے لئے بالکل کافی سمجھتا ہے اور خود اپنی اصلاح کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ یہ صورتِ حال اکبرؔ کے فلسفۂ اخلاق (یعنی اسلامی تعلیم) کے بالکل مخالف ہے یہاں ثواب کا عمل عبادتِ باری تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے نہ کہ شیطان پر لعنت بھیجنے کو۔ یورپ والے اگر ہمیں بے بس و بیکس سمجھکر ہمیں ہدف مظالم بنا رہے ہیں تو اُنھیں کوستے رہنا ہمارے ہاں کی تعلیم نہیں۔ ہم کو اپنی حالت کی ترقی و اصلاح کی فکر کرنا چاہیئے۔ حضرت اکبرؔ فرماتے ہیں کہ شیطان نے اغوا کی ایک جدید ترکیب یہ نکالی ہے کہ بندگانِ خدا سے اپنے اوپر لعنت بھجواتا رہتا ہے کہ اس مشغولیت سے انھیں حمد باری کی فرصت

ہی نہ نکلے ؎

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی   خدا کی حمد کیجئے ترک بن مجھ کو بُرا کہئے

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ دشمن اگر ہمارے ساتھ ظلم وستم کر رہا ہے اور ہم محض اس پر لعنت بھیجنے پر قانع ہیں تو ہم اور وہ دونوں تباہ ہو کر رہیں گے۔ فطرت اُس سے جور وستم کا انتقام لے گی اور ہم سے ہماری غفلت وجمود کا۔ عدو کی تباہی ہماری ترقی کی مستلزم نہیں ؎

یہی خصائل یہی طبیعت رہی تو قسمت یہی رہیگی   زمانہ بدلے گا بھی تو پھر کیا ہماری حالت یہی رہیگی

یہی سیہ کاریاں اگر ہیں تو نور صبح اُمید کیسا   یہی ہے زُلفِ بتاں کا سودا تو میری شامت یہی رہیگی

عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکر عصیان غیر کیسا   عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے تو اپنی قسمت یہی رہیگی

سکون خاطر واطمینان قلب اگر مقصود ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے جسے تمام ہادیان مذہب و تمام ائمہ اخلاق شروع سے بتاتے چلے آئے ہیں یعنی علایق دنیوی سے تا بہ امکان اعراض اور خالصتہً طاعت حق میں مصروفیت۔ مولانا رومی ارشاد فرماتے ہیں ؎

ہیچ کُنجے بے دد و بے دام نیست   جز بہ خلوتگاہِ حق آرام نیست

یہی نصیحت بیسویں صدی کے اِس عارف کی بھی ہے ؎

جو اہلِ دُنیا کا رُخ کروگے، سکون خاطر کبھی نہ ہوگا   شریک غفلت بہت ملیں گے، شریک عبرت کوئی نہ ہوگا

یہی ہے مذہب کا جزو اعظم کہ دین دُنیا پہ ہو مقدّم   نئے طریقہ میں لیکن اے دوست ہوگا سب کچھ یہی نہ ہوگا

صدیوں پیشتر اس آوازۂ حق کی منادی کر دی گئی تھی کہ اطمینان قلب و راحتِ دل صرف اُن لوگوں کا حصّہ ہے جو ایمان کامل رکھتے ہیں اور اپنی بداعمالیوں سے اپنے ایمان کو زنگ نہیں لگاتے۔ فَاَیُّ الفَرِیقَین اَحَقُّ بِالاَمنِ اِن کُنتُم تَعلَمُونَ ٥ اَلَّذِینَ اٰمَنُوا وَ لَم یَلبِسُوٓا اِیمَانَهُم بِظُلمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الاَمنُ وَهُم مُّهتَدُونَ (انعام- ۹) اکبر کی آواز بھی اسی آوازۂ حق کی صدائے بازگشت ہے۔ خلقت کو اصلاح دنیوی کا راستہ بتاتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلام مجید کے اوراق سامنے کھُلے ہوئے ہیں۔ انھیں کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتے چلے جاتے ہیں ذرا کان لگا کر سُننا ؎

(۱) یہ عزم ترا سعی بے وسماز ہو کیونکر — اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیونکر

(الف) وَمَا اَصَابَكُم مِن مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيدِيكُم (شوریٰ ع ۴) جو بھی مصیبت تمہارے اوپر آتی ہے خود تمہاری ہاتھوں آتی ہے

(ب) وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ (نساء ع ۱۱) تمھیں جو کچھ بھی برائی پیش آتی ہے خود تمہارے نفس کی لائی ہوتی ہے

(ج) اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى مَا يُغَيِّرُوا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (رعد - ۱۲) خدا کسی قوم کی حالت اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ اپنی حالت بدل دے۔

(۲) اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ ہے کام — طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا ہے یہ کام

(الف) وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (یوسف - ۳) خدا ہر قسم کے فراہمی اسباب پر قادر ہے۔ لیکن اکثر لوگ اِس سے بے خبر ہیں۔

(ب) اِنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا (بقر - ۲۰) ساری قوت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

(ج) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف - ۵) حکومت و اختیار صرف خدا کا ہے۔

(۳) بے طاعت و نیکی نہیں تاثیر دعا کچھ — آنے کی نہیں کام فقط حرص و ہوا کچھ

(الف) لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوْءًا يُجْزَ بِهِ (نساء - ۱۸) مسلمانوں فلاح عاقبت نہ تمہاری تمناؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر بلکہ عمل پر موقوف ہے بس جو شخص برا کام کریگا اُسکی سزا پائیگا

(۴) منظور اگر کبر و تفاخر کا سبق ہے — تخصیص تری کیا ہے حریفوں کو بھی حق ہے

(الف) هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ (تغابن - ۱) وہی خدا تو ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا تمھیں میں کافر بھی اسی نے پیدا کئے اور مومن بھی۔

(۵) یہ کشمکش فطرت دنیا ہے مسلسل — اک آج اگر صاحب طاقت ہے تو اک کل

(الف) وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (آل عمران ۱۴) ہم یہ زمانہ حکومت و کامرانی باری باری لوگوں کو دیتے رہتے ہیں

(۶) نیکی کی طرف رُخ ہو یہی ناموری ہے — کھوٹے کو جدا کردے وہی بات کھری ہے

(الف) اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (حجرات - ع ۲) تم میں جو سب سے زیادہ پاکباز ہے وہی خدا کے نزدیک سب سے معزز ہے

(ب) مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا (فاطر ع ۲) جو لوگ عزت کے خواستگار ہیں سو عزت تو ساری کی ساری صرف خدا ہی کی ہے

و "غیر متمدن"، کی زندگیوں کا موازنہ کافی ہے۔ شاعر کے ذہن میں یہ سب واقعات و مشاہدات محفوظ ہیں۔ آہ سرد کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ اپنا اخلاق، اپنا ایمان، اپنا جوہر شرافت، سب ہم نے آپ کی خوشنودی پر نثار کر دیا تھا، اپنوں کو محض آپ کی خاطر بیگانہ کر لیا تھا، لیکن اب جو نظر پھیر کر دیکھتے ہیں تو آپ کی تشریف آوری سے مصائب میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اور اخلاقی پلّہ روز بروز ہلکا ہی ہوتا چلا جاتا ہے ؎

مری عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھّا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں
جو دیکھا سائنس کا یہ چکر دھرم پکارا کہ اے برادر
ہماری دوری میں پُن مگن تھی، تمہاری دوری میں پاپ خوش ہیں

"ہمارا" "اُن کا" مشرق و مغرب کا یہ جو اختلاف ہے، جزئیات میں نہیں، کلیات میں ہے، فروع میں نہیں، اصول میں ہے۔ عوارض میں نہیں، ذوات میں ہے۔ بخت و اتفاق سے نہیں، جبلّت و سرشت میں ہے۔ وہ مادّیات میں مست ہیں، ہم روحانیات میں غرق۔ وہ ذہانت و تیز رفتاری، لذّت و ناموری کے بھوکے ہیں، ہم سنجیدگی و سلامت روی، راحت و گمنامی کے قدردان ہیں۔ وہ تجارت و ثروت کی گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں، ہم فقر و استغنا کے حجرہ میں معتکف ہیں۔ ان پر حصول ممالک و خزاین کی دھن سوار ہے، ہم تسخیر قلوب و نفوس کے عمل میں مشغول ہیں۔ وہ دنیا سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہم خود اپنے نفس سے۔ انھیں اپنے کولمبس و نیوٹن، کوپرنیکس و گلیلو، ڈیکارٹ و کینٹ پر ناز ہے۔ ہمیں اپنے کرشن و گوتم بدھ، نانک و کبیر، حضرت صدیقؓ و حضرت امیرؑ پر فخر ہے۔ وہ اِس پر تُلے ہوئے ہیں کہ مادّہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے رہیں گے، ہم اپنے سفر میں کائنات مادّی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہ انتہائے عقل و تحقیق میں یہ دریافت کر کے اُچھل پڑتے ہیں کہ "انسان بندر ہے"، ہم انتہائی بدمستی و بیہوشی میں پکارنے لگتے ہیں کہ "انسان خدا ہے"۔ اکبر اس دریا کو کوزہ میں بند کر کے پیش کرتے ہیں ؎

مشرقی کو ہے ذوق روحانی
مغربی میں ہے میل جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
"فکر ہر کس بہ قدر ہمّت اوست"

اکبر محض واعظ نہ تھے۔ حکیم اخلاق بھی تھے۔ راہِ راست کی جانب اشارہ کر کے خاموش ہو جانے

والے نہ تھے، بلکہ اس راستہ کی پیچیدگیوں اور سفر کی دقتوں سے بھی واقف تھے، اس لئے آیندہ مسافروں کو ان چیزوں کی بابت بھی ہدایات دیتے جاتے ہیں۔ اخلاق کے اکثر مسائل بہ غایت پیچیدہ واقع ہوئے ہیں، جذبات فطرت کی کشش ایک سمت ہوتی ہے، عاقبت اندیشی کا فتویٰ اس کے مخالف جانب ہوتا ہے۔ اکبر نے جابجا ان گتھیوں کو بھی سلجھایا ہے۔ ان کے کلام میں متعدد مقدمات ایسے آتے ہیں، جہاں اخلاق و معاشرت کے جزئیات نہیں، بلکہ فلسفۂ اخلاق کے اُصول کو بیان کیا ہے، اور مسائل اساسی کی عقدہ کشائی کی ہے۔

شباب کی بدمستیاں و بے احتیاطیاں جس غضب کی ہوتی ہیں، ہر شخص پر روشن ہیں۔ ساتھ ہی مذہب و اخلاق کے دارالافتاء سے ہر لغزش پر انتہائی تعزیر کی وعید موجود ہے۔ اکبر اس مسئلہ سے متعلق پہلے حکیمانہ ژرف نگاہی کے ساتھ انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں، اور مرض کی ایک ایک علامت بیان کر جاتے ہیں، اس کے بعد نسخۂ شفا تجویز کرتے ہیں یہ تشخیص اور یہ علاج اس قدر مکمل ہے کہ اس میں ایک حرف کی ترمیم و اضافہ کی گنجایش نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی اور نفس نے چاہا رشک پری	شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا، اور نفس کی خواہش بھی ہے روا	شیطان کا ساتھ البتہ بُرا، اور خوف خدا ہی اس کی دوا

بہت سے لوگ مذہب سے متعلق واقفیت و معلومات محض اس لئے حاصل کر رکھتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے ان کا اظہار کرتے رہیں، یا یہ کہ دوسروں کے افعال پر رائے زنی کرتے رہیں۔ خود ان معلومات پر عمل کرنا انہیں مقصود نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی زبانی واقفیت محض لاحاصل ہے۔ مذہب و اخلاق سے فائدہ اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ان کی تعلیمات پر عمل کر کے انھیں جزو زندگی بنا لیا جائے۔ نہ یہ کہ ان کے تذکرہ سے گرمی محفل کا کام لیا جائے۔ لیکن عمل بغیر نفس کشی کے ممکن نہیں۔ نفس کو لذت تو صرف دوسروں کے بتانے میں آتی ہے ؎

علم دیں حاصل کیا، لیکن قباحت یہ ہوئی	صرف سکھلانے میں لذت ہے عمل میں کچھ نہیں
زیست کا مصرعہ بنے خود آہ سوزاں تب ہے لطف	ورنہ اے اکبر تری نظم غزل میں کچھ نہیں

کسی مذہب کا نام لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل شے پاکیزگیِ اخلاق ہے۔ کفر و ایمان مذہبی اصطلاحیں ہیں جو اخلاق حسنہ،

واخلاق سیئہ کے مُرادف ہیں۔ جو پاک طینت ہیں وہ مومن ہیں، جو بدطینت ہیں، کافر ہیں ؎

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں — جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں بُرے جو ہیں وہ کافر ہیں

وہی ہیں پاک طینت لوگ ہے جن کی خالق سے — نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست بس وہ طاہر ہیں

موجودہ زمانہ میں مذہب کی سوشل حیثیت بہت اہم ہوگئی ہے۔ ایک شخص عیسائی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عیسائیوں سے میل جول رکھتا ہے، کھانے پینے رہنے سہنے کا طریق فرنگیوں کا سا رکھتا ہے۔ "بڑے دن" کے روز خوشی مناتا ہے۔ اگر شیعہ ہے تو معنی یہ ہیں کہ مُحرّم میں مجلس کرتا ہے، ماتم میں شریک ہوتا ہے۔ تعزیہ رکھتا ہے، شیعہ سوسائٹی میں گھلا ملا رہتا ہے۔ اگر سُنّی ہے تو معنی یہ ہیں کہ محفل میلاد کرتا رہتا ہے۔ صوفیہ کرام کی عظمت رکھتا ہے، اہل سنّت کی تقریبات میں شریک رہتا ہے، اپنے گھر کی ریت رسم سُنّیوں کی سی رکھتا ہے۔ کسی شخص نے تبدیل مذہب کر دیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنی سوسائٹی بدل دی اور اپنے سوشل طریقوں میں تغیر کر دیا۔ نجات و کمالِ اُخروی کا تعلق صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہے، لیکن مذہب کی ظاہری ہیئت محض ایک معاشری و اخلاقی واقعہ ہے۔ اس لئے دُنیا کو یہ دیکھنے کی بالکل حاجت نہیں کہ فلاں کے معتقدات کیا ہیں، بلکہ دیکھنا صرف یہ چاہیئے کہ اس کے اعمال و اخلاق کیسے ہیں ؎

مذہب ہے امر قومی، سمجھو نہ فعل ذاتی — معذور سب ہیں اس میں گنگو ہوں یا وفاتی

شیعہ ہوں خواہ سُنّی لالہ ہوں یا برہمن — مذہب کو مورثوں سے سب پاتے ہیں عموماً

پولیٹیکل ضرورت بیشک تھی اس کی اوّل — اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف سوشل

اچھّا برا نہ کہہ دو تم مذہبی بنا پر — اخلاق اس کے دیکھو اصلی تو یہ ہی جوہر

تعلیم ہے جو عمدہ صحت اگر ہے اچھی — پاؤگے اس کو اچھّا طینت اگر ہے اچھی

ناری ہے یا کہ ناجی، اس کا بیاں نہیں ہے — سوشل طریق یہ ہے اور وہ تو رازِ دیں ہے

قانون فطرت ایسا رکھا گیا ہے کہ ایک کے بڑھنے کے معنی دوسرے کے گھٹنے کے ہوتے ہیں۔ ایک شخص قمار بازی میں ہزار ہا روپیہ ہار بیٹھتا ہے، اس کے گھر میں ماتم برپا ہوتا ہے لیکن جس شخص نے ہزارہا روپیہ چند منٹ میں جیت لیے ہیں اس کے ہاں شادیانے بجتے ہوتے ہیں۔ پرانی آبادی کو ویران کر کے محکمۂ آرائش بلدہ

وہاں ایک خوشنما و خوش فضا پارک بنوانا ہے، خلقت وہاں تفریح کے لئے اُمنڈ اُمنڈ کے جمع ہوتی ہے اور ہر وقت ہنستی بولتی ہستیوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ لیکن ادھر بھی کبھی خیال گیا ہے کہ کتنے مکانات مسمار ہو کر یہ قطعۂ زمیں پارک کے لئے نکلا ہے اور اُن مکانات کے مکینوں کے دلوں پر اپنے پیارے گھروں کو چھوڑتے وقت اور انھیں منہدم ہوتے دیکھکر کیا کچھ گذری ہوگی! ایک فاتح اپنی فتحمندیوں کا جشن مناتا ہے، مگر یہ بھی کبھی یاد کرتا ہے کہ اِس کے باعث کتنے خاندان برباد، کتنے گھر بے چراغ اور کتنے زندہ مُردہ ہو چکے ہیں! ؎

یہ بات ہی صاف مجھ سے سُن لی، کتاب میں اِس کو کیا پڑھیگا — حدود دُنیا کے ہیں مُعیّن جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھیگا

انسان معاصی سے دستکش عموماً اُسی وقت ہوتا ہے جب گناہوں کی قوت سلب ہو چکتی ہے۔ ورنہ جب تک قوّت و سامان موجود ہے، نفس پرستیوں اور سیہ کاریوں کا سلسلہ موقوف نہیں ہوتا ؎

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہے — مگر اس بزم میں سچ ہے کہ "جی ہاں" ہے بہت
وعظِ تقویٰ نہ کہو رحم کرو اکبر پر — چشم بد دور ابھی طاقتِ عصیاں ہے بہت

نیک کاری و بدکاری کا ایک عمدہ معیار یہ ہے کہ اوّل الذکر کے بعد طبیعت میں شگفتگی پائی جاتی ہے اور آخر الذکر کے بعد سعی و اخفا، جو بُزدلی کے مرادف ہے ؎

شگفتہ پایا طبیعت کو بعدِ کارِ ثواب — دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

کتابی معلومات انسان کے جوہر باطن کو صیقل نہیں کر سکتے۔ اِس کے لئے اچھی صحبت ناگزیر ہے۔ عالم بے عمل یہی لوگ کہلاتے ہیں، جن کے دماغ کتابی معلومات سے لبریز ہیں، لیکن دل غفلت کی نیند سو رہے ہیں ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں — آدمی آدمی بناتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے — وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں[1]

انسان کے خلاف مزاج دُنیا میں ہزارہا واقعات پیش آتے رہتے ہیں، لیکن کارخانۂ دہر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا اِس کے بس کی بات نہیں۔ اِس لئے مآل اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر نا ملایم واقعہ پر صبر و

---

[1] ایک اور موقع پر ؎

کام نکلے گا نہ اے دوست کتبخانوں سے — رہیئے کچھ روز کسی محرمِ اسرار کے ساتھ

تسلیم سے کام لے۔ انسان ناز اُسی سے کرسکتا ہی جو اِس کا ناز بردار ہو۔ تمام موافق طبع و غیر موافق طبع حوادث پر صبر و تحمل کرنا۔ بہت کا لالچ نہ کرنا، کم کا غم نہ کرنا، یہی اُصول ایسے ہیں جو زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دیں گے ؎

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیوں کر کروں — بیجا آتا ہی مجھے غصہ مگر کس پر کروں

چل بسے چھوٹے بڑے تھا جن سے لطفِ زندگی — مجھ پہ کس کو ناز ہی میں ناز اب کس پر کروں

وصل کی شب حسب موسم ہو ہی جائے گی بسر — لطف اُٹھاؤں یا درازی کی دُعا شب بھر کروں

دور بے مہری اُمید محبت کس سے ہو — اُڑ رہی ہی خاک ہر سو کس کے دل میں گھر کروں

کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خاص مصلحت کے ساتھ حرکت کر رہا ہی۔ ہر فعل کا ادنیٰ سے ادنیٰ کیوں نہ ہو معاوضہ کسی نہ کسی صورت سے مل کر رہیگا۔ انسان اگر اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور دل کو عیش و عشرت کے پھندے میں نہ پھنسنے دے تو زندگی بڑے امن و عافیت کے ساتھ گزر سکتی ہی۔ عام حیات میں تلخی پیدا کرنے والی ہماری ہی غفلت شعاریاں ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کو ایک مُسلسل غزل میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہی ؎

اکبر اس فطرتِ خاموش کو بے حس نہ سمجھ — ہاں بصیرت سے تہی دیدۂ نرگس نہ سمجھ

راحتِ زیست کے سامان سے دھوکے میں نہ آ — امتحاں گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ

جاہ و منصب میں نظر عاقبتِ کار پہ رکھ — خاتمہ جس کا ہو افسوس اسے آفس نہ سمجھ

صبر کے ساتھ مُصیبت میں جو ہو حُسنِ عمل — بہرِ انجام یہ امرت ہی اسے بس نہ سمجھ

دل کا دُنیا کی اُمیدوں سے بہلنا ہی بُرا — زندگی تلخ کریں گی انھیں مونس نہ سمجھ

تعصب اور غصہ کے جذبات عموماً تنگ نظری کی بنا پر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کی نظر جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہی۔ نفرت و تعصب سے بھی نجات ملتی جاتی ہے۔ البتہ کارخانہ فطرت کی عظمت و تنوع کو دیکھکر حیرت طاری ہوتی رہتی ہی ؎

شیخ جی کی نظر میں ہیں ہوں فقط — میری نظروں میں ساری دُنیا ہی

بس یہی وجہ ہے کہ اے اکبرؔ — مجھکو حیرت ہے اُن کو غصہ ہی

علایق دنیوی کی کثرت ہمیشہ افزایش غم و الم کا سبب بنے گی۔ امن و عافیت مقصود ہی تو دنیوی تعلقات کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیئے ؎

کام دُنیا کا یونہی چلتا ہے ایک جمتا ہے ایک پگھلتا ہے
پانوں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے دل تعلق بڑھا کے پچھتایا

انسان دوسرے کی عیب چینی و نقص جوئی میں تو بہت پیش پیش آتا رہتا ہی، لیکن خود اپنی کمزوریوں اور خطاکاریوں کی جانب کبھی بھولے سے بھی توجہ نہیں کرتا۔ اس کو کس پُر لطف انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

یہ تو کہیئے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہی میری نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سُنا

انسان کی نسبت سب سے زیادہ صحیح رائے خود اپنی کا ضمیر قایم کر سکتا ہی کہ وہی اس کی اصلی کمزوریوں سے واقف ہوتا ہی۔ انسان ساری دُنیا کو دھوکے میں ڈال سکتا ہی۔ لیکن خود اپنی ضمیر سے کوئی شے مخفی نہیں رکھ سکتا ؎

تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہی نہ بھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہی

محض گوشہ نشینی تزکیہ اخلاق کے لیے کافی نہیں، اصل شی قلب کی بے تعلقی ہی اور اس کا مدار عمل پر ہی۔ اچھی باتوں کے زبانی داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں، دل سے ماننے والے جو ان پر عمل کر دکھائیں بہت کم نکلتے ہیں ؎

خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کونا اور ہے حرص دُنیا سے نہیں ہر صاحبِ عزلت بری
خوب کہنا اور ہی اور خوب ہونا اور ہے مدحتِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند

نفس بشری کی ایک خاص کمزوری جو دنیا پر ہمیشہ سے مُسلط رہی ہی اور ابنائے عصر خصوصیت کے ساتھ جس کا شکار ہو رہی ہیں یہ ہے کہ انسان بدکاروں کی بدکاری پر انھیں بُرا بھلا کہہ لینا اپنے لئے بالکل کافی سمجھتا ہی اور خود اپنی اصلاح کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ یہ صورتِ حال اکبرؔ کے فلسفۂ اخلاق (یعنی اسلامی تعلیم) کے بالکل مخالف ہی یہاں ثواب کا عمل عبادت باریِ تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے نہ کہ شیطان پر لعنت بھیجنے کو۔ یورپ والے اگر ہمیں بے بس و بیکس سمجھکر ہمیں ہدف مظالم بنا رہے ہیں تو انھیں کوستے رہنا ہمارے ہاں کی تعلیم نہیں۔ ہم کو اپنی حالت کی ترقی و اصلاح کی فکر کرنا چاہیئے۔ حضرت اکبرؔ فرماتے ہیں کہ شیطان نے اغوا کی ایک جدید ترکیب یہ نکالی ہی کہ بندگانِ خدا سے اپنے اوپر لعنت بھجواتا رہتا ہی کہ اس مشغولیت سے انھیں حمد باری کی فرصت

ہی نہ نکلے ؎

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی — خدا کی حمد کیجیے ترک، بس مجھ کو بُرا کہئے

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ دشمن اگر ہمارے ساتھ ظلم وستم کر رہا ہے اور ہم محض اس پر لعنت بھیجنے پر قانع ہیں تو ہم اور وہ دونوں تباہ ہو کر رہیں گے۔ فطرت اُس سے جور وستم کا انتقام لے گی اور ہم سے ہماری غفلت وجمود کا۔ عدو کی تباہی ہماری ترقی کی مستلزم نہیں ؎

یہی خصائل یہی طبیعت رہی تو قسمت یہی رہیگی — زمانہ بدلے گا بھی تو پھر کیا ہماری حالت یہی رہیگی

یہی سیہ کاریاں اگر ہیں تو نورِ صبح اُمید کیسا — یہی ہے زُلفِ بتاں کا سودا تو میری شامت یہی رہیگی

عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکرِ عصیانِ غیر کیسا — عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے تو اپنی قسمت یہی رہیگی

سکونِ خاطر واطمینانِ قلب اگر مقصود ہے تو اس کا ایک ہی رستہ ہے جسے تمام ہادیانِ مذہب وتمام ائمۂ اخلاق شروع سے بتاتے چلے آئے ہیں، یعنی علایق دنیوی سے تا بہ امکان اعراض اور خالصۃً طاعت حق میں مصروفیت۔ مولانا رومی ارشاد فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے دد وبے دام نیست — جز بخلوتگاہِ حق آرام نیست

یہی نصیحت بیسویں صدی کے اس عارف کی بھی ہے ؎

جو اہلِ دُنیا کا رُخ کرو گے، سکونِ خاطر کبھی نہ ہو گا — شریکِ غفلت بہت ملیں گے، شریکِ عبرت کوئی نہ ہو گا

یہی ہے مذہب کا جزوِ اعظم کہ دین دُنیا پہ ہو مقدم — نئے طریقہ میں لیکن اے دوست ہو گا سب کچھ یہی نہ ہو گا

صدیوں پیشتر اس آوازۂ حق کی منادی کردی گئی تھی کہ اطمینانِ قلب وراحتِ دل صرف اُن لوگوں کا حصّہ ہے جو ایمانِ کامل رکھتے ہیں اور اپنی بداعمالیوں سے اپنے ایمان کو زنگ نہیں لگاتے۔ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ (انعام - ۹) اکبر کی آواز بھی اسی آوازۂ حق کی صدائے بازگشت ہے۔ خلقت کو اصلاحِ دنیوی کا راستہ بتاتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ مجید کے اوراق سامنے کھُلے ہوئے ہیں۔ انھیں کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ذرا کان لگا کر سُنا ؎

(۱) یہ عزم ترا سعی بے ومساز ہو کیوں کر — اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیوں کر

(الف) وَمَا اَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ (شوریٰ ع ۴) جو بھی مصیبت تمہارے اوپر آتی ہے خود تمہاری ہاتھوں آتی ہے

(ب) وَمَا اَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ (نساء ع ۱۱) تمھیں جو کچھ بھی برائی پیش آتی ہے خود تمہارے نفس کی لائی ہوتی ہے

(ج) اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِاَنفُسِهِمْ (رعد - ۱۲) خدا کسی قوم کی حالت اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ اپنی حالت بدل دے۔

(۲) اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ ہے کام — طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا ہے یہ کام

(الف) وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (یوسف - ۳) خدا ہر قسم کے فراہمی اسباب پر قادر ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں۔

(ب) اِنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا (بقر - ۲۰) ساری قوت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

(ج) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف - ۵) حکومت و اختیار صرف خدا کا ہے۔

(۳) بے طاعت و نیکی نہیں تاثیر دعا کچھ — آنے کی نہیں کام فقط حرص و ہوا کچھ

(الف) لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ مَن يَعْمَلْ سُوٓءًا يُجْزَ بِهٖ (نساء - ۱۸) مسلمانوں فلاح عاقبت نہ تمہاری تمناؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر بلکہ عمل پر موقوف ہے پس جو شخص برا کام کریگا اسکی سزا پائیگا

(۴) منظور اگر کبر و تفاخر کا سبق ہے — تخصیص تری کیا ہے حریفوں کو بھی حق ہے

(الف) هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ (تغابن - ۱) وہی خدا تو ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا تمھیں میں کافر بھی اسی نے پیدا کئے اور مومن بھی۔

(۵) یہ کشمکش فطرت دنیا ہے مسلسل — اک آج اگر صاحب طاقت ہے تو اک کل

(الف) وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (آل عمران ۱۴) ہم یہ زمانہ حکومت و کامرانی باری باری لوگوں کو دیتے رہتے ہیں

(۶) نیکی کی طرف رخ ہو یہی ناموری ہے — کھوٹے کو جدا کر دے وہی بات کھری ہے

(الف) اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (حجرات - ع ۲) تم میں جو سب سے زیادہ پاکباز ہے وہی خدا کے نزدیک سب سے معزز ہے

(ب) مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا (فاطر ع ۲) جو لوگ عزت کے خواستگار ہیں سو عزت تو ساری کی ساری صرف خدا ہی کی ہے

لیکن یہ سارا دفترِ وعظ و پند، یہ ساری شاعری و بلاغت، یہ ساری فلسفہ سنجی و نکتہ آفرینی ایک طرف اور فطرت کی رفتار، مشیّتِ الٰہی کا رُخ دوسری طرف۔ جس ماورائے عقلِ انسانی و مافوق فہمِ بشری ہستی نے انبیاءِ کرام کے ثمراتِ ہدایت کو ایک محدود دائرہ سے آگے نہ بڑھنے دیا، جس نے ہادیانِ اعظم کی مساعی کے باوجود دلوں سے زنگ نہ دُور ہونے دیا، جس نے مُرشدانِ کامل کے حلقۂ فیض کو ہر دَور میں بہت ہی مختصر رکھا، وہ اپنی عادتِ جاریہ میں بیسویں صدی کے ایک مُصلح شاعر کی خاطر فرق نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ ہدایت و ضلالت، انسان کے اختیار کی چیزیں نہیں۔ کارخانۂ کائنات کی بنیاد جس غفلت پر رکھی گئی ہے، اسی پر یہ کارخانہ برابر چلتا رہیگا۔ بڑی بڑی مقبول و برگزیدہ ہستیاں بھی فطرت کے اس کورس کو نہیں بدل سکتیں۔ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ (یوسف - ۱۱) اکبرؔ بھی اس تماشا گاہ پر اپنا پارٹ جملہ لوازمِ کمال و جمال کے ساتھ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔ لیکن چلتے چلتے یہ بھی کہتے گئے کہ میری یا کسی کی تبلیغ سے زمانہ کا رُخ نہیں پھر سکتا، چند روز میں اجداد و اسلاف کے باقی آثار بھی افسانۂ پارینہ ہوں گے، اور اُس وقت کوئی نوحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا، اس لئے کہ احساسات بدلے ہوئے ہوں گے کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کوئی قیمتی چیز ہم سے ضائع ہو گئی ع

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

بچہ عنفوانِ شباب میں قدم رکھتے وقت جدید احساسات کا مزہ لینے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ بھولے سے بھی ادھر خیال نہیں جاتا کہ کیسے قابلِ رشک سُکھ اور بےفکری کا زمانہ رُخصت ہو رہا ہے اور فکروں اور ذمّہ داریوں کا کتنا سخت بوجھ سر پر پڑنے والا ہے۔ آنکھ کھلتی ہے۔ مگر کب؟ جب وقت ہاتھ سے نکلے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی حشر ہماری موجودہ معاشرت کا بھی ہونا ہے۔ اکبرؔ کے جامِ جم میں اس قلبِ ماہیّت کے ایک ایک جزیہ کا عکس موجود ہے۔ بہتر ہوگا، مرثیہ کا یہ آخری بند سُنا کر مجلس کو کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کر دیا جائے ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی — نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردہ کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے

بدل جائیگا اندازِ طبائع دَورِ گردوں سے
نئی صُورت کی خوشیاں اور نئے سامانِ غم ہوں گے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملّت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پُتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مُغنّی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال سم ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

بدل جائیگا معیارِ شرافت چشمِ دُنیا میں
زیادہ ہیں جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

کسی کو اس تغیر کا نہ حسؔ ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہُت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

احوالِ اسم

(از جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی پی ایچ ڈی ۔ پرنسپل عثمانیہ کالج ۔ حیدرآباد دکن)

اُردُو بولنے والی قوم اپنی زبان کے صرف و نحو سے ایسی بے پرواہ ہی کہ دنیا کی متمدّن قوموں میں اُس کی مثال مُشکل سے ملے گی ۔ اسی بے پروائی کا نتیجہ ہی کہ عوام کی نظر میں اُردُو ایک بے قاعدہ زبان تصوّر کی جانے لگی ہی ۔ مگر سچ پوچھو تو یہ خیال بالکل بیجا ہے ۔ ہر زبان کی صرف و نحو میں کچھُ نہ کچھ دِقّتیں یا پیچیدگیاں موجود میں جن کو سلجھانے کی کوشش اُس زبان کے نحویوں کی طرف سے ہوتی رہی اور رفتہ رفتہ اِس مبحث پر اِتنا مواد جمع ہو گیا کہ زبان کے سیکھنے والے اُس کی مدد سے اپنی مُشکلوں کو آسانی سے حل کر سکتے ہیں ۔ اُردُو میں ابھی تک ایسا مواد اِتنا کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہی ۔ اِس لئے نہایت ضروری ہی کہ اُردُو صرف و نحو کے سارے پیچیدہ مسئلے ایک ایک کر کے سلجھائے جائیں ۔ اِس مضمون میں " احوال اسم " کو بیان کرتا ہوں ۔ اربابِ ذوق سے امید ہی کہ اس میرے بیان میں جو سُقم یا کمی پائیں اُس سے مجھے ضرور اطلاع بخشیں گے ۔

اُردُو میں اِسموں کے آخر میں الف یا اُس کا کوئی ہم آواز حرف : ہ ، ی ، ع کبھی بدل کے ے ، نون یا و ہو جاتا ہی[1] ۔ فارسی اور انگریزی میں ، جن کی تحصیل کا ہندوستان میں عام رواج ہی ۔ ایسی کوئی تبدیلی واقع نہیں

---

[1] مولوی نورالحسن نیّر نے اس تبدیل کو اِمالہ قرار دیا ہی (ادیب اُردُو ، لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۲۱ء ص ۲-۴) لیکن اِمالہ ایک اور ہی چیز ہے ، اِس اُردُو والی تبدیل کو اُس سے سرِمو تعلق نہیں ۔ ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ عربی میں اِمالہ کسے کہتے ہیں ۔ قدیم عربی میں اِمالہ نہیں پایا جاتا اس بعد کی عربی میں اور جہاں عربی بولی جاتی ہی اُن میں سے بعض مقامات میں اِس کا اِستعمال ہوتا ہی ۔
اِمالے کا اثر لفظ کے معنی پر مطلق نہیں ہوتا ۔ صرف تلفّظ پر ہوتا ہی یعنی فتحہ ایک مجہول کسرہ ہو جاتا ہی یا الف ماقبل مفتوح کی جگہ یِ ماقبل مکسور بولی جاتی ہی ۔ یا یوں کہیئے کہ اَ سے اِ (مجہول کسرہ) اور آ سے اے (مجہول ے) ہو جاتا ہی ۔ بعض حالتوں میں کسرہ اور یِ مجہول نہیں بلکہ معروف ہوتے ہیں ۔ مثالیں یہ ہیں :- رِکاب سے رِکیب ، لکِن سے لیکن ، باب سے بیب ، لِسان سے لِسین ، ایسی تغیر سے لفظ کے معنی یا حالتِ نحوی میں کوئی فرق نہیں ہوتا ۔ یعنی یہ نہیں کہ حالتِ رفع میں ایک صورت (رِکاب) استعمال ہو تو حالتِ نصب

ہوتی ۔ اس لئے اُردو بولنے والے جب ان زبانوں سے اپنی زبان کا مقابلہ کرتے ہیں تو اُن کو یہ تبدیل ایک بیکار زحمت معلوم ہوتی ہے۔ پس پہلے یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اور زبانوں میں اس قسم کی تبدیل کہاں تک پائی جاتی ہے۔

عربی میں ایسی تبدیل کو صرف کہتے ہیں[2] اور یورپ کی زبانوں میں ڈیک لین شن (Declension) یعنی گردان ۔ کسی گردان میں اِسم کی جو مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں اُن میں سے ہر ایک کو انگریزی میں کیس (Case = لاتینی Casus کازس) اور عربی میں حالت کہتے ہیں ۔ ترکی میں ان کے لئے احوالِ اِسم اصطلاح مقرر ہے۔

بہت سی زبانیں ہیں جن میں اِسم کی کئی حالتیں ہوتی ہیں ، جیسے عربی میں تین (۱) فاعلی (جسے رفع کہتے ہیں) (۲) مفعولی (جسے نصب کہتے ہیں) ، (۳) اضافی وظرفی (جسے جر کہتے ہیں) یونانی اور موجودہ جرمانی زبان میں اِسم کی چار حالتیں ہوتی ہیں : (۱) فاعلی ، (۲) مفعولی ، (۳) اضافی ، (۴) ربطی ۔ لاتینی میں چھے حالتیں ہیں (۱) فاعلی ، (۲) مفعولی ، (۳) اضافی ، (۴) ربطی ، (۵) اخراجی ، (۶) ندائی ۔ ترکی میں بھی چھے حالتیں ہیں ۔ مثلاً ترکی میں "پدر" کی گردان یوں ہوگی :-

احوالِ اِسم		واحد		معنی
(۱) فاعلی	————	پدر	————	باپ (نے)
(۲) مفعولی	————	پدری	————	باپ (کو)
(۳) ربطی	————	پدره	————	باپ (کو)

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل یا حالتِ جر میں دوسری (ترکیب)

دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے ۔ کہ اِمالہ لفظ کے درمیان میں واقع ہوتا یا ہو سکتا ہے لیکن اُردو کی جس تبدیل سے ہم یہاں بحث کر رہے ہیں وہ لفظ کے آخر ہی میں واقع ہوتی ہے۔

یہ کہنا بھی درست نہیں کہ " اِصطلاحِ قواعدِ اُردو میں الف ہ یا الفِ مقصورہ کو جو الفاظ کے آخر میں پڑیں جمع کی حالت میں یا حرفِ ربط کے ساتھ یائے مجہول سے بدل دینے کو اِمالہ کہتے ہیں ۔ اُردو کے قواعد کی کسی کتاب میں آج تک یہ اِصطلاح اِن معنوں میں استعمال نہیں ہوئی ۔ جس طرح شاهِد ان سے شاهِدِین ہو جانا اِمالہ نہیں ہے۔ اسی طرح لڑکا سے لڑکے یا بندہ سے بندے ہو جانا بھی اِمالہ نہیں کہلا سکتا ۔

[1] انگریزی میں صرف ضمیروں کی حالت میں تبدیل ہوتی ہے ۔ جیسے ہی ۔ ہز ، ہم وغیرہ

[2] عموماً یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ صرف یا گردان فعل کے ساتھ مخصوص ہے مگر اسم کو منصرف یا غیر منصرف کہنا ہی اس امر کی کافی دلیل ہے کہ اسم میں صرف کی گنجایش ہے۔

(۴) اِضافی ــــــــــ پدرِک (تلفّظ: پدرِن) ــــــــــ باپ کا (کی، کے)

(۵) ظرفی ــــــــــ پدرِہ ــــــــــ باپ میں

(۶) اِخراجی ــــــــــ پدرون ــــــــــ باپ سے

قدیم فارسی (یعنی اوِستا اور ایران کے پیکانی کتبوں کی زبان) میں اِسم کی آٹھ حالتیں ہیں یعنی ترکی میں جو چھ حالتیں بیان ہوئیں اُن کے عِلاوہ (۷) اوزاری اور (۸) ندائی۔ لیکن بعد کو وسطیٰ زمانے کی فارسی (یعنی پہلوی وغیرہ) میں چوں کہ اکثر اواخر گر چکے تھے اِسم کی مختلف حالتوں میں اِمتیاز باقی نہ رہا۔ البتّہ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس سے پہلے ایک زمانہ ایسا گزر چکا ہے۔ جس میں صِرف دو حالتیں (یعنی قائم اور مُحرّف) باقی رہ گئی ہوں گی اور پھر وہ محرّف حالت بھی غائب ہو گئی۔ وسطیٰ زمانے کی فارسی بلکہ موجودہ فارسی میں بھی[۱] کہیں کہیں بعض مرکّب لفظوں میں کسی اِسم کی مُحرّف صورت کے آثار نظر آتے ہیں، جیسے کاریگر، بُرزیگر، کدیور، دلیور (= دلاور[۲]) شبیخون وغیرہ میں سے بعض ایرانی زبانوں جیسے پشتو، بلوچی، آسی (یا اوسے تینی[۳]) وغیرہ میں آج بھی اِسم کی دو حالتیں (یعنی قائم اور مُحرّف) موجود ہیں۔

قدیم فارسی کی طرح سنسکرِت میں بھی آٹھ حالتیں ہیں اور پراکرِت میں سات (کیوں کہ پراکرِت کی اکثر بولیوں میں ربطی اور اِضافی کی صورت ایک ہی ہے) یہ سات گھٹ کر اُردو میں صِرف دو رہ گئیں: ایک صحیح یا قائم، دوسری مُحرّف۔ یہی حال اکثر موجودہ سنسکرِتی زبانوں کا ہے۔ اب اگر سنسکرت کی طرح اُردو میں بھی آٹھ حالتیں قائم کی جائیں تو اُن کی صورت اس طرح پر ہو گی۔

واحد

حالت	اُردو - کیلا (مُذکّر)	سنسکرت - کیل (مذکر)[۴]
		कील
فاعلی	کیلا (یا کیلے نے)	کیلہ : कील:

---

[۱] موجودہ فارسی میں صِرف ایک ندائی حالت باقی ہے، جیسے "ساقیا"

[۲] یاد رہے کہ "دِلاور" کو "دل" اور "آور" سے مرکب سمجھنا درست نہیں۔

[۳] آسی زبان جس ملک میں بولی جاتی ہے وہ ۴۲ درجے ۵ دقیقے اور ۴۳ درجہ ۲۰ دقیقے شمالی عرض بلد اور ۱۶ درجے ۱۰ دقیقے اور ۴۲ درجے ۲۰ دقیقے مشرقی طول بلد کے درمیان واقع ہے اسی طرح پر آسی قوم کوہ قاف کے دامنوں، وادیوں اور گھاٹیوں میں سکونت پذیر ہے۔ اس علاقے کا رقبہ کوئی ۲۰۵ یا ۲۱۰ مُربع میل ہے۔ اور ۱۹۱۰ء کی مردم شماری کے مُطابق آسیوں کی تعداد صرف ۱۷۲۰۰۰ ہے۔

[۴] سنسکرت میں "کیل" چینی یا فاس (wedge) کو کہتے ہیں اور اُردو "کیل" یا "کیلا" وہی لفظ ہے۔

مفعولی ---- کیلا (یا کیلے کو) ---------- کیلَمْ कीलम्

رَبطی ---------- کیلے کو ---------- کیلاۓ कीलाय

اَوزاری ---- ، سے (یعنی کیلے کے ذریعہ سے) ---- کیلے نَ कीलन

اِخراجی ---- ، سے (یعنی کیلے میں سے) ---- کیلاتْ कीलात्

اِضافی ---- ، کا (کی ، کے) ---------- کیلَس یَ कीलस्य

ظَرفی ---- ، میں (پر ، کے اوپر ، تلے وغیرہ)[1] ---- کیلے कीले

نِدائی ---- ، (یا اے کیلے) ---------- کیلَ कील

جمع

فا ---- کیلے (یا کیلوں نے) ---------- کیلاہ कीलाः

مف ---- ، (یا کیلوں کو) ---------- کیلان कीलान्

رب ---- کیلوں کو ---------- کیلیبھیَ कीलेभ्य

او ---- ، سے ---------- کیلیہہ कीलै

اِخ ---- ، سے ---------- کیلیبھیَ कीलेभ्य

اِض ---- ، کا (کی ، کے) ---------- کیلانامْ कीलानाम

ظر ---- ، میں (پر ، تلے وغیرہ) ---------- کیلے شُ कीलेष

نِد ---- کیلو (یا اے کیلو) ---------- کیلاہ कीलाः

اِس مثال سے واضح ہی کہ سنسکرِت میں ایک ایسا مذکر اِسم جو زبر پر ختم ہوتا ہو حالت کے لحاظ سے مختلف آٹھ صورتیں اختیار کرتا ہی یعنی ہر حالت کے لئے ایک خاص لاحقہ[2] اَصل لفظ پر داخل ہوتا ہی ۔ بخلاف اس کے اُردو میں الف پر ختم

---

[1] اُردو میں جو حرف ظرفیت کے لئے آتے ہیں وہ یہ ہیں :- پر ، کے اُوپر ، کے نیچے ، کے تلے ، تلے ، کے اِدھر ، کے اُدھر ، میں ، کے اندر ، سے ، تک ، کو (جیسے صبح کو وغیرہ) ۔

[2] سنسکرِت میں اسم کی مختلف حالتوں میں جو حرف آخر میں زیادہ ہو جاتے ہیں وہ مُستقِل لفظ نہیں ہیں ۔ اس لئے اُن کو "ادا خریا" "لاحقے" کہنا چاہیے ۔ اُردو میں جو معنوی حُروف اِستعمال ہوتے ہیں (جیسے نے ، کو ، میں ، پر ، تک ، سے وغیرہ) یہ "لاحقے" نہیں ہیں بلکہ مُستقِل لفظ ہیں ۔

ہونے والے ایک اِسم کی صرف دو صورتیں ہوتی ہیں اور فاعلی اور مفعولی حالت میں اُن دونوں میں سے ہر صورت ممکن ہے یا یوں کہئے کہ فاعلی اور مفعولی حالت کے ساتھ کوئی ایک صورت مخصوص نہیں۔ پس اِسم کی حالتوں کے جو نام سنسکرت کے لئے رکھے گئے ہیں وہ اُردو کے لئے کام نہیں دے سکتے۔

اس مختصر مقدمہ کے بعد اب دیکھنا چاہیے کہ اُردو میں اِسم کی کیا حالتیں مقرر کی جاسکتی ہیں اور اُن کے استعمال کے کیا قاعدے ہیں۔

اُردو میں احوالِ اِسم

اُردو میں اِسم کی دو حالتیں ہوسکتی ہیں: (۱) قایم اور (۲) مُحرّف۔

(۱) جب کسی اِسم کے بعد کوئی حرفِ ربط (یعنی حرفِ معنوی یا عامل) نہ آئے تو وہ اِسم اپنی اصلی حالت پر قایم رہتا ہے۔ اِسے ہم "قایم حالت" کہتے ہیں۔

(۲) جب کسی اِسم کے بعد کوئی حرفِ ربط آئے تو اُس کے آخر میں کسی آواز کا بدل جانا یا بعضی آوازوں کا اضافہ ہوجانا ممکن ہوتا ہے۔ اِسے ہم "محرّف حالت" کہتے ہیں۔

جنس۔ حالت اور عدد کے لحاظ سے اِسم کی چند گردانیں ممکن ہیں۔

(۱) مذکّر اسموں کی گردانیں یہ ہیں:-

پہلی گردان

حالت	واحد	جمع
قایم	بیل	بیل
مُحرّف	بیل	بیلوں[1]

اِس گردان میں وہ تمام مذکّر اسم داخل ہیں جو الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر نہیں ختم ہوتے۔ جیسے ہاتھ، کان، پان، بال، سال، پھول، پیٹ، پانو، گانو، نام، کام، پھل، بھید، چھید۔ تیر، پیر، پنیر، بسیر، سراب، گرداب، فراق، قزاق، جنگل، دنگل، آنچل، بادل، کنول، رنگ، ڈھنگ، خدنگ، ملنگ

---

[1] ندا کی حالت میں آخر کا نون غنّہ گر جاتا ہے یعنی محض "بیلو"۔

نہنگ ، چور ، مور (پرندہ) ، اور چھور ، جھاڑ ، پہاڑ وغیرہ۔

جَو ، پیرُو ، نَو ، سَو وغیرہ۔

آڑُو ، آلُو ، آنڈُو ، آنسُو ، اُچھّو ، اُلّو ، بازُو ، بچھّو ، بجر بٹّو ، چُلّو ، رفُو ، زانُو ، قابُو ، یابُو ، بابُو ، شبّو ، گُل خیرُو ، چاقُو ، جادُو ، کھٹّو (ایک قسم کا زرد پتھّر) ہندُو ، ستُّو ، سنبھالُو وغیرہ۔

پانی ، جی ، دہی ، گھی ، موتی ، دھوبی ، درزی ، گندھی ، آڑھتی ، باورچی ، توپچی ، غُبارچی ، نِچگی وغیرہ۔

فائدہ - اِسی گردان میں وہ مُذکّر اِسم بھی داخل ہیں جو وَ (یعنی لین یا ساکن واوِ علّت[1]) یا وٗ (یعنی معرُوف واو) یا یٖ (یعنی معرُوف یے) پر ختم ہوتے ہیں ؛ البتّہ اِن میں اِتنا تغیُّر ہوتا ہے کہ جب حالتِ محرّف (جمع) میں وں اُن پر بڑھایا جاتا ہی تو اِسم کے آخر کا طویل حرفِ علّت خفیف ہو جاتا ہے ؛ جیسے پیرُو سے پیرُووں (= پیرُ ُوں) یا آلُو سے آلُووں (= آلُ ُوں) ؛ دھوبی سے (= دھوبِ ِوں) وغیرہ۔ حقیقت میں یہ تغیُّر محض آوازوں کے باہمی ربط یا تناسب پر مبنی ہی ؛ اِسی لئے اِس میں کسی جنس کی تخصیص نہیں۔ چنانچہ مونث اِسموں میں بھی بعینہٖ یہی تغیُّر واقع ہوتا ہے ، جیسے لڑکی سے لڑکیاں (= لڑکِ یاں) ، اور لڑکیوں (= لڑکِ یوں) وغیرہ۔

دُوسری گردان

حالت	واحد	جمع
قائِم	بکرا	بکرے
مُحرّف	بکرے	بکروں

سوا اُن اِسموں کے[2] جن کا ذکر تیسری گردان میں آئے گا ، اِس دُوسری گردان میں وہ سب مُذکّر اسم داخل ہیں جو

---

[1] واو ہمیشہ حرفِ علت نہیں ہوتا بلکہ کبھی حرفِ صحیح بھی ہوتا ہی ؛ جیسے وارث ، جواب ، سہو ، وہ ، والا وغیرہ میں یہی حال ے کا بھی ہے ؛ ے ، دی ، تے ، وغیرہ میں حرفِ علّت ہی اور یہ ، کیا ، لیا ، یاد ، یاس وغیرہ میں حرفِ صحیح۔

[2] اُن اسموں کو بھی خارج سمجھنا چاہیے جو کسی حال میں نہیں بدلتے اور اس لئے غیر مُنصرِف کہلاتے ہیں۔

الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم ہوتے ہیں، جیسے انڈا، بنڈا، سنڈا، آرہ، پردہ، زردہ، گردہ، درجہ، بندہ، دیوانہ، فرزانہ، جلوہ، جلسہ، تقاضا، تماشا، ناشتا، تمغا، ماجرا، چرچا، کمرہ، دعویٰ (= دعوا) فتویٰ (= فتوا)، چالیا، گھاتیا، جھلیا، من چلا، بت بنا، اکل کھرا، دیوان خانہ، مے خانہ، ڈاک خانہ، اداءت خانہ تجربہ خانہ، ندیدہ، آب خورہ، آب دانہ (= آب و دانہ)، آب خاصہ وغیرہ اور اُردو کے مصدر جیسے لکھنا، آنا، کھانا وغیرہ[1]

فائدہ ۱ - جغرافی نام جو خفیف ہ پر ختم ہوتے ہیں۔ اِسی گردان میں شامل ہیں جیسے آگرہ[2]، کلکتہ، کوفہ، بصرہ، جدہ، سکندرہ، باندہ، گونڈہ، تھوبہ، سندیلہ، پچھریٹھ، گلبرگہ، گولکنڈہ، مکہ، مدینہ، مغل پورہ، توبہ، دجلہ، مگر افریقہ، قاہرہ اور قسطنطنیہ۔

فائدہ ۲ - اں پر ختم ہونے والے لفظوں میں اے کی جگہ ایں بڑھایا جاتا ہے۔ جیسے دھواں سے دھویں کنواں سے کنویں، ساتواں (ایک غلہ) بھلاواں، روَیاں (یا رواں یعنی چھوٹا بال) سے ساتویں، بھلاویں، رُوئیں، پانچواں سے پانچویں، ساتواں سے ساتویں، آٹھواں سے آٹھویں، نواں سے نویں، دسواں سے دسویں وغیرہ[3]۔

لیکن وہ لفظ اِس زمرے میں داخل نہیں جن کا نون صرف شعر میں غنّہ پڑھا جا سکتا ہے اور نثر میں ہمیشہ ظاہر، جیسے

ع سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔

تیسری گردان

حالت	واحد	جمع
قایم	دریا	دریا
محرّف	دریا	دریاؤں

اس گردان میں وہ تمام مذکّر اسم داخل ہیں جو باوجود الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم ہونے کے دہمر

---

[1] یاد رہے کہ مصدر جب اسم جامد کے طور پر استعمال نہ کیا جائے تو اُس کی جمع نہیں آتی۔

[2] ان کی جمع ممکن نہیں۔ واحد آگرے سے کلکتے تک، کوفے سے بصرے تک، جدے میں وغیرہ، موذن مرحبا بروقت بولا تیری آواز مکے اور مدینے (ذوق)۔

[3] پرانی زبان میں سماں (= وقت) سے سمیں آتا تھا جیسے (میر) ؎ اِک زمانے میں دِل کی خواہش تھا۔ اک سمیں میں جگر کی کاہش تھا۔ مگر اب "سماں میں" بولتے ہیں۔ اصل اس لفظ کی ہندی سے समय ہے (اب بھی سمے بولتے ہیں۔ او یغر)

گردان کے مطابق نہیں گردانے جاتے ۔ اُن اسموں کی تفصیل یہ ہے ۔

(۱) لقب، عہدوں کے نام وغیرہ، جیسے آغا، آقا، خواجہ، راجا[1]، رانا، مہراجا (مہاراجا)، بھیّا[2]، لالا، مُلّا، خلیفہ[3]، مولا، مولانا، میرزا (مرزا) آغا مینا وغیرہ۔

(۲) رشتوں کے وہ نام جن سے چھوٹے، بڑوں کو پکارتے ہیں: جیسے ابّا، بابا، باوا، دادا[1]، نانا، چچا، تایا، پھپا، مما (یعنی ماموں) آکا، پتا۔

(۳) غیر زبانوں کے اسم فاعل اور مرکبات جو الف پر ختم ہوتے ہیں بہ شرطیکہ وہ اُردو میں بالکل گھل مل نہ گئے ہوں ۔ جیسے کارفرما، طلسم کشا، بادنما، قطب نما، قبلہ نما، حرارت پیما، دانا، بینا، یکتا، آشنا، شناسا، آہن رُبا، کاہ رُبا (کہربا)۔

(۴) غیر زبانوں کے چند اسم (جو کسی عام تعریف کے تحت میں نہیں آتے) خدا، ہما، دریا، صحرا، زنا، عنقا۔ سُہا۔

غیر منصرف مذکر اسم

یہ مذکر اسم کسی حالت میں نہیں بدلتے :-

(۱) مردوں کے نام، خطاب، تخلّص وغیرہ[4]، جیسے زکریّا، طٰہٰ، طلحہ، عُبیدہ، بشیرا، شفیعا، مسیحا، مرتضیٰ، مصطفیٰ، ابوہریرہ، ذوالرمّہ، عیسیٰ، موسیٰ، چھیدا، محتشم الدولہ، نوّاب دولہا، انشا، ذکا، سخا، سودا ضیا وغیرہ[5]۔

(۲) ملکوں، شہروں، دریاؤں، پہاڑوں اور دیگر غیر ذی روح چیزوں کے نام جو الف پر ختم ہوتے ہیں جیسے ایشیا، امریکا، برما، بخارا، بطحا، منا، حما، بلیا، پروشیا، صنعا، گیا (شہر) متھرا، کسیا، کالکا،

---

[1] بعض لوگ دادے اور دادوں اور راجے اور راجوں بولتے ہیں لیکن یہ صورتیں غیر فصیح ہیں۔
[2] اس لفظ سے چھوٹوں کو بھی مخاطب کرتے ہیں [3] بعض لوگ جمع محرّف کی حالت مُلّوں اور خلیفوں بھی بولتے ہیں۔
[4] یہ ظاہر ہی کہ علم، تخلّص، خطاب وغیرہ کی جمع نہیں آسکتی۔
[5] ظاہر ہی کہ علم، خطاب، تخلّص وغیرہ کی جمع نہیں آسکتی۔

ہِمالیا، سپنا (طوٗر) گھاگرا، نرٗبدا، الحمرا وغیرہ[۱]

فائدہ۔ نئے ناموں کو الف کے ساتھ لکھنا چاہیئے بہ شرطے کہ وہ غیر مُنصرِف بولے جائیں، جیسے افریقا، آسٹرلیا، اِڈِنبرا، اِٹالیا، رومانیا، بلغاریا وغیرہ۔

(۳) غیر زبانوں کے آلف پر ختم ہونے والے لفظ جو اُرُدوٗ میں ابھی تک جذب نہیں ہوئے یا جو جذب نہیں ہو سکتے جیسے اِجرا، اِخفا، اِتقا، اِثنا، اِحیا، اِختراع، اِفترا، اِقتدا، اِقتضا، استثنا، اِستہزا، اِغوا، اِفشا، ایلا ایفا، ایما، سما، مُنشا[۲]

فائدہ۔ اِس قِسم کے بعضے لفظ ہیں جِن کو مُتقدِّمین نے غیر مُنصَرِف استعمال کیا ہی اِس لئے کہ اُن کے زمانے تک وہ لفظ اُردوٗ میں پوٗری طرح مُتمکِّن نہ ہوئے تھے اور وُہی لفظ اب، چوں کہ اُردوٗ میں کثرت سے استعمال ہونے لگے ہیں، منصرف بولے جاتے ہیں، جیسے تقوٰی، تقاضا وغیرہ۔

چنانچہ غالب نے کہا ہی :۔

دِل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دِماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا[۳]

اور آج بھی بعض لوگ "منشاء کا" اور "فتوٰی کا" بولتے ہیں اور بعض لوگ "منشے کا" اور "فتوے کا" وغیرہ۔

(۴) ایسے لفظ جِن سے پہلے یا جن کے بعد فارسی کا کسرۂ اِضافت یا عربی کا اَل یا فارسی یا عربی کا عطف ہو وہ اُرُدوٗ کا کوئی تغیُّر یا صَرف قبول نہیں کرتے، جیسے جوہرِ آئینہ، حُسنِ تقاضا، جوہرِ اندیشہ، دِل و دیدہ، تقاضائے سِن

---

[۱] ظاہر ہی کہ علم خطاب تخلص وغیرہ کی جمع نہیں آ سکتی [۲] ان میں سے اکثر لفظ ایسے ہیں کہ حقیقت میں الف پر نہیں بلکہ ہمزہ پر ختم ہوتے ہیں۔

[۳] جناب حسرت موہانی کا یہ کہنا بجا نہیں کہ یہاں "تقاضے کا" کی جگہہ "تقاضا کا" بالکل بے قاعدہ ..... استعمال کیا گیا ہی" (شرح دیوانِ غالب۔ مُقدمہ ص ۱۵) اسی طرح غالب نے ایک اور لفظ کو بھی استعمال کیا ہی اور وہ لفظ بھی اُردوٗ میں غیر مانوس ہی اور صرف شعر میں شاذ و نادر استعمال ہوتا ہی

ع آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے ٭ نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہی اُنگلی جادہ سے

یہاں "جادے سے" نہیں پڑھا جا سکتا۔ اِس پر مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نے اپنی شرح (طبع دوم ص ۲۵۲، ۲۵۳) میں وہی حسرت والا اعتراض کیا ہی مگر اِس حقیر کی رائے میں اساتذہ کے کلام پر اعتراض کرنے سے پہلے اُس سے اِستفادہ کرنا چاہیئے! حقیقت یہ ہی کہ جب غیر زبانوں کے لفظ کسی زبان میں پہلے پہل آتے ہیں تو اکثر وہ اپنی اصلی حالت پر قایم رہتے ہیں اور جب اجنبی زبان میں پوری طرح ممکن ہو جاتے ہیں تب وہ اُسی زبان کے لفظوں کی طرح گردانے جانے لگتے ہیں اور بعض لفظ بڑی مدت تک

قافلہ سالار، سالارِ قافلہ، امیرُالقافلہ، دارُالاِملا، بیت الخلا وغیرہ۔

فائدہ۔ عربی کے بعضے ایسے مرکب جو اُردو میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں مُنصرف بھی نہیں بہ شرطے کہ وہ مختفی ۃ پر ختم ہوتے ہیں۔ جیسے "دارُالترجمے میں"، دارُالاِقامے سے وغیرہ۔

(۵) غیر زبانوں کی جمع، جیسے انبیا، اولیا، عُلما، طلبہ، مرضیٰ، ڈیٹا (Data) فِنومنا (Phenomena) وغیرہ۔

فائدہ۔ انبیاؤں، اولیاؤں، عُلماؤں غلط اور غیر فصیح صورتیں ہیں۔ فارسی کی جمع اُردو میں بالکل متروک ہی صرف فارسی ترکیبوں میں استعمال ہوتی ہے، البتّہ لفظ "صاحبان" کبھی کبھی استعمال ہوتا ہی لیکن اُس کا بھی ترک اولیٰ ہی۔

(۶) کوئی لفظ یا جُملہ جب خود مقصود ہو جیسے "کرنا" سے بہت سے صیغے مشتق ہیں۔
ایسے لفظوں کو ہمیشہ قول نشانوں یا قوسین میں رکھنا چاہیے یا اُن پر خطِ کھینچ دینا چاہیے۔

۲۔ مونّث اِسم کی تصریف نِسبتہً آسان، اس لئے کہ تمام واحد مونّث اِسم غیر مُنصرف ہیں یعنی واحد کی دونوں حالتوں قایم اور مُحرّف میں لفظ کی صورت ایک ہی رہتی ہی۔

مونّث اِسموں کی گردانیں یہ ہیں:۔

پہلی گردان

حالت	واحِد	جمع
قایم	ناک	ناکیں
مُحرّف	ناک	ناکوں[1]

اِس گردان میں وہ تمام مونّث اِسم داخل ہیں جو ی یا یا پر نہیں ختم ہوتے، جیسے آب (چمک، دمک، رونق) تاب، چوب، شراب، طناب، بھاپ، تھاپ، توپ، چاپ، سیپ، آخرت، آفت، آنت، بالشت، دوات بناوٹ، جھانج۔ شیرینج، اُپج، آنچ، اِصلاح، اِصطلاح، شرح، تاریخ، اُمّید، نوید، تلوار، جاگیر، بھیڑ، تجویز

---

[1] ندا کی حالت میں یہ نون ہمیشہ گرجاتا ہی۔

نماز، نیاز، پیاس، بھینس، آزمایش، جوارِش، حِرص، بیاض، شرط، اِطّلاع، تیغ، ردیف، خندق، چھینک
آنکھ، ٹانگ، پھلانگ، جھیل، پھاگل، دلیل، شیرمال، افیم، شام، شبنم، ، ران، شان، کان (= معدن)
آہ، افواہ، بانہہ، تھاہ، راہ، کُلاہ، نِگاہ، چاے، راے، سراے، اگاے وغیرہ۔

اِبتدا، ادا، اِشتہا، اِلتجا، اِنشا، بِپتا، بیوا، بقا، بقایا، بھاکھا، پچھوا، پُروا، تمنّا، جاترا، جفا، جِلا
حِنا، حیا، رِجا، سبھا، سزا، شِفا، ضِیا وغیرہ

آرزو، بہو، بو، بدبو، جُستجو، جو، تو، خوبو، خوشبو، جھاڑو، رو (مطابقت) رو، بدرو، پو، لو،
شے، تھے، ے، نے، لے۔

فائدہ ۱۔ جو مؤنث لفظ الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم ہوتے ہیں اُن کو بھی اسی گردان میں شامل سمجھنا چاہیے البتہ ضرورتِ صوتی کی بِنا پر جمع کی صورتوں میں فقط یں یا وں نہیں بلکہ ءیں اور ءوں اصل لفظ میں بڑھاتے ہیں۔ جیسے ہوائیں، ہواؤں، دوائیں، دواءوں ؛ بیوائیں، بیواؤں ؛ بیوہ سے بیوائیں اور بیواؤں وایہ سے دایائیں اور دایاءوں، قحبہ سے قحبائیں اور قحباءوں وغیرہ۔

فائدہ ۲۔ جو مؤنث لفظ و پر ختم ہوتے ہیں وہ بھی اِسی گردان میں داخل ہیں اور اُن میں بھی جمع کی صورتوں میں ءیں اور ءوں بڑھاتے ہیں جیسے آرزوئیں اور آرزوءوں۔ ہاں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ٹھیٹ اُردو لفظ ہو تو و کی آواز جمع کی دونوں حالتوں میں قصیر رہ جاتی ہے یعنی بہو سے بہوئیں (= بَ ہُ ءیں) اور بہوءوں (= بَ ہُ ءوں) اور جھاڑو سے جھاڑوئیں (= جھاڑُ ءیں) اور جھاڑوءوں (= جھاڑُوں) بخلاف اِس کے غیر زبانوں سے جو لفظ اُردو میں آگئے ہیں اُن کی و کی آواز پوری یعنی طویل ہی رہتی ہے (مقابلہ کرو۔ مذکر کی پہلی گردان فائدہ)

فائدہ ۳۔ لین واو یا لین ی پر ختم ہونے والے لفظوں کے آخر میں جو و یا ی ہو جمع کی صورتوں میں اُس کی آواز بھی ہمیشہ قصیر ہو جاتی ہے جیسے بدرو سے بدرویں، پو سے پویں، لو سے لویں، تھے سے تھیں وغیرہ

دوسری گردان

حالت	واحد	جمع
قائم	بکری	بکریاں

مُحرّف	بکری	بکریوں[1]

اس گردان میں وہ سب مُونّث اِسم داخل ہیں جو معرُوف یَ پر ختم ہوتے ہیں؛ جیسے بلّی، ٹوپی، جھولی، کُرتی وغیرہ۔

تیسری گردان

حالت	واحد	جمع
قائم	ڈِبیا	ڈِبیاں
مُحرّف	ڈِبیا	ڈِبیوں[1]

اس گردان میں وہ سب مُونّث اِسم داخل ہیں جو یا پر ختم ہوتے ہیں، جیسے بُڑھیا، ٹِلیا، ڈُکھیا، ڈِبیا، چُھیا، چِڑیا وغیرہ، مگر غیر زبانوں کے لفظ اس گردان میں نہیں بلکہ پہلی گردان میں داخل ہیں جیسے آسِیا، ضیا، حیا وغیرہ۔

فائدہ تیسری گردان کے لفظ عمُوماً اِسم تصغیر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ غیر زبانوں کے مُونّث اِسم جو یا پر تو ختم ہوتے ہیں مگر اِسم تصغیر نہیں اس گردان کی تحت میں نہیں آتے۔

فائدہ ۱۔ ایسے مرکب لفظ جن کے آخر کا جُز دار دان یا والا ہو تو پہلے جُز کی محرّف حالت پر (نہ کہ قائم حالت پر) دُوسرا جُز داخل کیا جائے گا جیسے تھانے دار، ٹھیکے دار، سُرمے دان، بکرے والا، بکری والا، بکروں والا بکریوں والا۔

اب اِن گردانوں پر ایک نظر ڈالئے تو آسانی سے حسبِ ذیل کُلیّے اور جُزئیے قائم کئے جا سکتے ہیں:

(۱) جمع (چاہے مُذکّر یا مُونّث کی کسی گردان سے ہو) مُحرّف حالت میں ہمیشہ وں (اور ندا کی حالت میں و) پر ختم ہوتی ہے۔

(۲) تمام مُونّث لفظ (چاہے کسی گردان کے ہوں) واحد مُحرّف میں کوئی تغیّر قبول نہیں کر سکتے۔ یعنی قائم اور مُحرّف

---

[1] ندا کی حالت میں یہ نون ہمیشہ گر جاتا ہے

دونوں حالتوں میں اُن کی صورت ایک ہی رہتی ہے۔

(۳) تمام مذکّر لفظ جو الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم نہیں ہوتے واحد محرّف اور جمع قائم میں مطلق کسی قسم کا تغیّر نہیں قبول کرتے، صرف جمع محرّف میں تغیّر قبول کرتے ہیں (جس کا ذکر فقرہ ا میں ہو چکا ہے)

(۴) جو مذکّر لفظ الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم ہوتے ہیں واحد محرّف اور جمع قائم میں اُن کا حرف بدل کر ے ہو جاتا ہے؛ جیسے لڑکا سے لڑکے، بندہ سے بندے، دعویٰ سے دعوے، ضلع (= زِلا) سے ضلعے (= زِلے) قلعہ سے قلعے، مصرعہ سے مصرعے[1]

(۵) بعض مذکّر لفظ ایسے بھی ہیں جو اگرچہ الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم ہوتے ہیں پھر بھی کسی تغیّر کو قبول نہیں کرتے، ایسے لفظوں کو ہم "غیر منصرف" کہتے ہیں۔

اس شجرے سے معلوم ہوگا کہ کون سے اسم کہاں تک تغیّر کو قبول کرتے ہیں:-

- اِسم
  - واحد
    - مؤنّث: تغیّر کو قبول نہیں کرتے
    - مذکّر
      - جو الف یا اُس کے ہم آواز حرف پر ختم نہیں ہوتے تغیّر کو قبول نہیں کرتے۔
      - جو الف یا اُس کے ہم آواز حرف پر ختم ہوتے ہیں تغیّر پذیر ہیں (چند مستثنیات کے ساتھ)
  - جمع: تغیّر پذیر ہیں (سوا غیر زبانوں کی جمعوں کی)
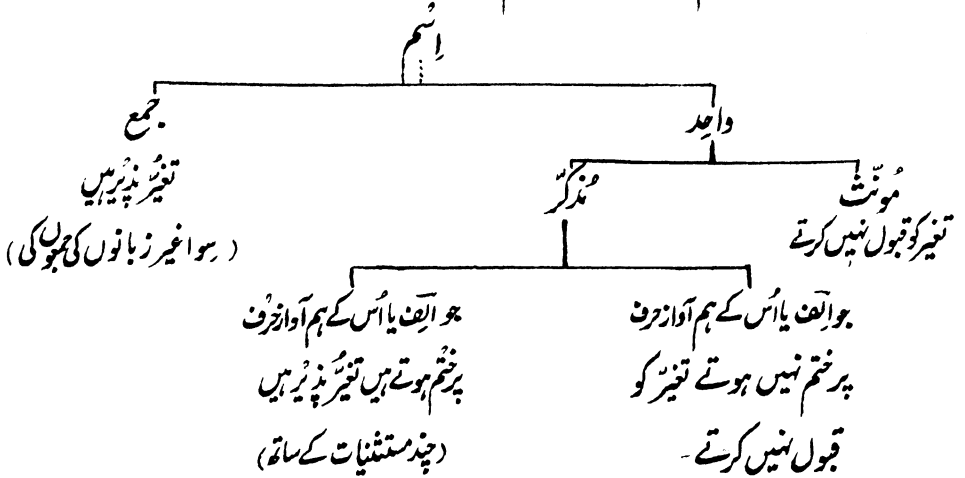
(۳) صِفت کی گردان

صرف وہ صفتیں منصرف ہیں جن کا مذکّر الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر اور جس کا مؤنّث ی پر ختم ہو۔ ایسی صفتوں کی گردان کی صورت یہ ہے:-

---

[1] ع اُردو میں شدید حلقی آواز سے نہیں بولا جاتا۔ اُس سے پہلے اگر زبر ہو تو الف کا اور زیر ہو تو ے کا ہم آواز ہوتا ہے تحریر میں اُسے ے سے بدلنے کا رواج نہیں ہے لیکن پڑھنے اور بولنے میں اس کی آواز بالکل الف یا ے کی سی ہوتی ہے۔

مُذکّر

حالت	واحِد	جمع
قائم	اچّھا (لڑکا)	اچھّے (لڑکے)
مُحرّف	اچھّے (لڑکے)	اچھّے (لڑکوں)

مُونّث

(غیر منصرف)

حالت	واحد	جمع
قائم	اچھّی (لڑکی)	اچھّی (لڑکیاں)
مُحرّف	اچھی (لڑکی)	اچھّی (لڑکیوں)

اِس گَردان میں وہ تمام صفتیں داخِل ہیں جو ٹھیٹ اُردُو کی ہیں۔

فائدہ ۱: غیر زبانوں کے جو لفظ اُردُو میں صِفت کے طور پر مستعمل ہیں وہ غیر منصرف ہیں جیسے اعلیٰ ، ادنیٰ عُمدہ ، گُستہ ، اُفتادہ وغیرہ ۔ اِن میں سے جب کوئی لفظ کسی اِسم کے ساتھ صِفت کے طور پر آئے تو اِسم کی جنس عدد یا حالت کا کوئی اثر صِفت پر نہ پڑے گا۔ یعنی ادنیٰ (= اُدنا) درجہ ، اعلیٰ (= اعلا) ہستی ، عُمدہ چیز ، زیادہ مقدار ، وغیرہ بولیں گے ۔ عمدی ، عُمدے ؛ زیادی ، زیادے ؛ ادنی ، ادنے وغیرہ غلط صورتیں ہیں۔

ایک فارسی کا لفظ تازہ اِس قاعدے سے مُستثنیٰ ہی ! اگر اِسم (موصوف) عربی یا فارسی لفظ ہی تو اس کی صِفت "تازہ" غیر مُنصرِف ہو گی ، جیسے تازہ حال ، تازہ خبر ، تازہ شیرینی ، لیکن اگر موصوف ایک ہندی لفظ ہی تو اُس کی صِفت "تازہ" کی گردان اسی طرح ہو گی ۔ جیسے " اچھا " کی ۔ یعنی تازی روٹی ، تازے پانی میں ، تازی ملائی ، تازی مٹھائی ، تازی ربڑی وغیرہ۔

عربی لفظ "خاص" سے اُردُو والوں نے " خاصا " ، " خاصی " ، " خاصے " بنایا جِس کے معنی ہیں " اچّھا ، پورا " اُس کی گَردان اُردُو صِفتوں کی طرح ہوتی ہی یعنی "خاصا" ، "خاصی" ، "خاصے" وغیرہ اِسی طرح ایک اور عربی لفظ "بعض" ہے ۔ جس پر کبھی الف ، ی ، ے وغیرہ بڑھا کر اُردُو صِفت کی طرح گردانتے ہیں : بعضا ، بعضی ، بعضے ، بعضوں ۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ بعضا ، بعضی ۔ بعضے تو ہندیوں کا اختراع ، ی

اوراب متروک ہے ۔ لیکن اس فقیر حقیر کی رائے میں اِن لفظوں میں کوئی عیب نہیں کیوں کہ اُردو کے مُستند اُستادوں نے اِن کو استعمال کیا ہی اور اُن کا یہ استعمال اُردو زبان کے موافق ہی۔

فائدہ ۲ ۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اُردو کی بعض صفتوں کے آخر میں نسبت کی ی ہوتی ہی اور یہ تانیث کی ی کی طرح بدلتی نہیں ۔ جیسے کھاری ، بھاری ۔ اِس لئے "کھارا پانی" اور "بھارا صندوق" غلط ہوگا ۔ "کھاری پانی" اور "بھاری صندوق" کہنا چاہیئے۔

کُلیّہ ۔ صِفت اگر جامد اِسم کے طور پر استعمال ہو تو اس کی کیفیت بالکل اِسم کی سی ہوگی ، جیسے اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں ، ہم تو بُروں کی جان کو پہلے ہی رُو چکے ، اپنے پیاروں کا صدقہ دو وغیرہ۔

۴۔ مرکّب صِفت کی گردان۔

مُذکّر

حالت	واحِد	جمع
قائم	لکھّا ہوا (خط)	لکھّے ہوئے (خط)
مُحرّف	لکھّے ہوئے (خط)	لکھے ہوئے (خطوں)

اسی طرح دوڑتا ہوا (گھوڑا) دوڑتے ہوئے گھوڑے نے ٹھوکرلی ، گھبرایا ہوا شخص ، گھبرائے ہوئے آدمی سے کیا ہوسکتا ہے ، لکھے ہوئے کاغذوں کو ضائع نہ کرنا۔

مؤنّث

حالت	واحِد	جمع
قائم	پھٹی ہوئی (کتاب)	پھٹی ہوئی (کتابیں)
مُحرّف	پھٹی ہوئی (کتاب)	پھٹی ہوئی (کتابوں)

فائدہ ۔ مُرکب صِفت اگر جامد اِسم کے طور پر استعمال ہو تو اس کی گردان یوں ہوگی ۔

مُذکّر

حالت	واحد	جمع
قائم	بھُولا ہوا	بھولے ہوئے

مُحرّف	بھولے ہوئے	بھولے ہوؤں

اِسی طرح : " لکھے پڑھوں سے ایسی غلطی بعید ہے " مگر لکھے پڑھے لوگوں سے ایسی غلطی بعید ہے۔"

مُؤنّث

ایسی مرکب صفتیں جن کا آخر جز " ہوئی ہو " عموماً اسم جامد کے طور پر استعمال نہیں ہوتیں ۔ اس لئے مُؤنث کی کوئی گردان قائم نہیں ہو سکتی ۔

(۵) ضمیر کی گردان

وہ ضمیریں جن کا مُذکر اَلِف پر اور جن کا مُؤنث یَ پر ختم ہوتا ہے صفت کی طرح گردانی جاتی ہیں ۔ جیسے تیرا ، تیری ، میرا ، میری ، تمھارا ، تمھاری ؛ ہمارا ، ہماری ، اپنا ، اپنی اور یہی حال ہے کا ، کی اور سا ، سی اور ایسا ، جیسا ، کیسا ، ویسا کا ۔ اگر ایسی کوئی ضمیر اسم کی جگہ پر استعمال ہو تو اُس کی گردان اسم کی سی ہوگی ۔

(۲) جو ضمیریں اَلف یا یَ پر ختم نہیں ہوتیں اُن میں جنس کی کوئی تمیز نہیں ، صرف عدد کا اِمتیاز ہے ۔ اُن کی گردانیں یہ ہیں ۔

حالت	واحد (مُذکر اور مونث)	جمع (مُذکر اور مُؤنث)
قائم	وَہ ، یہ ، جو ، کوَن ، کیا	وُہ ، یہ ، کوَن ، کیا
مُحرّف	اُس ، اِس ، جِس ، کِس اُسے ، اِسے ، جِسے ، کِسے (یعنی اُس کو ، اِس کو وغیرہ)	اُن ، اِن ، جِن ، کِن ۔ اور صرف نے سے پہلے اُنھوں ، اِنھوں ، جنھوں ، کنھوں [۱] ، اُنھیں ، اِنھیں ، جنھیں ، کنھیں ، (= اُن کو اِن کو وغیرہ)
قائم	تو ، ہیں	تم ، ہم

---

[۱] قدیم زبان میں ان صورتوں کے ساتھ نے کی تخصیص نہ تھی یعنی اُنھوں کو ، اُنھوں سے وغیرہ بولتے تھے ۔ " سب " کے لفظ کے ساتھ جب کوئی عامل آتا تو سبھوں یا سبھوں استعمال کرتے تھے ۔ لیکن اب متروک ہے ۔ اور " سب " غیر منصرف ہے ۔

مُحرّف	تُجھ ، مُجھ	تُم ، ہم
(سوا اضافی کے)	تُجھے ، مُجھے (=تُجھ کو ، مُجھ کو)	تُمھیں ، ہمیں (=تم کو ، ہم کو)
اِضافی	تیرا ، میرا (تیری ، میری مؤنث)	تُمھارا ، میرا (تمھاری ، میری مؤنث)

"کوئی" مُحرّف حالت میں "کسی" ہو جاتا ہے۔ لیکن جب عدد ، مِقدار وقت وغیرہ کا تخمینہ بیان ہو تو "کسی" نہیں آتا بلکہ مُحرّف حالت میں بھی "کوئی" ہی استعمال ہوتا ہے : جیسے "یہ کپڑا کوئی دو روپئے کا ہوگا"۔ "کوئی دم میں سارا حال معلوم ہوا جاتا ہے" وغیرہ

۶۔ مُتعلّقِ فعل اور حرف کی گردان

(۱) بعضے اِسم یا صِفتیں وغیرہ اپنی مُحرّف صُورتوں میں مُتعلّقِ فعل یا حرف کا کام دیتی ہیں اور مقام سمت ، طور ، سبب ذریعہ ، وقت بتاتی ہیں ۔ جیسے آگے چل ، پیچھے ہٹ ، نیچے دیکھ ، اُس کے گھر کے پچھواڑے ایک آم کا درخت ہے سویرے اُٹھ ، دس بجے کھانا کھا ، مرنے پیچھے (پر) امیر غریب سب برابر ہیں ، دہنے ، بائیں دیکھ کر چل ، سامنے آ۔

(۲) جو حرفِ معنوی الف پر ختم ہوتے ہیں وہ بھی منصرف ہیں اور اُن کی گردان صفت کی گردان کے مماثل ہوتی ہے ۔ : جیسے (ا) حرفِ اِضافت : کا ، کی ، کے ؛ (ب) حرفِ تشبیہ : سا ، جیسا جن کا بیان ضمیر کے ذیل میں آچکا ہے۔

عوامِل

جن تغیّرات کا اوپر بیان ہُوا ان کو جو لفظ ، ترکیبیں یا کیفیتیں عمل میں لاتی ہیں ، اُن کو "عوامل" کہتے ہیں۔

عامل دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) لفظی اور (۲) معنوی۔

(۱) "لفظی عامِل" اُس لفظ کو کہتے ہیں جو عبارت میں موجود ہو اور کسی دوسرے لفظ کی قائم حالت کو مُحرّف میں تبدیل کر دے ۔

لفظی عاملوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) اضافت کے حرف : کا ، کی ، کے ،

(۲) ظرفیت کے حرف : سے ، تک ، میں ، کنے، تلے ، بیچ ، نیچے ، پر ، اوپر ، کے اوپر ، کے باہر

(۳) فاعلیت کا حرف : نے

(۴) مفعولیت کے حرف : کو ، سے ، کے تئیں۔

(۵) معیّت کے حرف : سمیت ، کے ساتھ ، مع ...... کے

(۶) ندا کے حرف : اے ، او ، ارے ، اری ، اجی۔

ندا کے حرفوں کے سوا سب اپنے ماقبل پر عمل کرتے ہیں۔

(۲) "معنوی عامل" اُس کیفیت یا ترکیب کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی لفظ متغیّر ہو (اور کوئی ایسا لفظی عامل موجود نہ ہو جو اُس تغیّر کا باعث ہوسکتا ہو)۔

معنوی عاملوں کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) جب کوئی لفظی عامل مقدر یا محذوف ہو ؛ جیسے اِتّفاقاً

اِتّفاقاً اِک آشنا میرے ٭ گئے تھے اِک عمدہ کے دیرے (سودا)

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دِن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سی بات کرنا (مصحفی)

پہلے شعر میں (دیرے) کو ، دوسرے میں (کوچے) میں اور (بہانے) سے مقدّر ہیں۔

(۲) کسی اِسم یا فقرے کا مُتعلّقِ فِعل ہونا ؛ جیسے "وہ یُوں ہی گیا" ۔ "میں جیسے چاہوں ویسے کام کروں گا"۔

عامِل کہاں تک عمل کرتا ہے

ایک اکیلے عامِل کا اثر اُس کے تمام ماقبل اِسموں ، صِفتوں ، حرفوں وغیرہ پر پڑتا ہے ، جیسا کہ ان مثالوں سے واضح ہوگا۔

لہ متروک

(۱) وہ لڑکا آیا، یہ گھوڑا جاتا ہی۔ وُہ تقریر کر رہا تھا کہ میں پہنچ گیا۔ ایک اچھّا خاصا اونچا پوُرا جوان کھڑا تھا (اِن جُملوں میں چوُں کہ کوئی عامِل نہیں اس لئے سب ضمیریں، اِسم اور صفتیں قائم حالت میں ہیں)

(۲) اُس لڑکے نے کہا۔ اِس گھوڑے کو دیکھو۔ اُس کی تقریر ہو رہی تھی کہ میں پہنچ گیا۔ (اِن جملوں میں "نے"، "کو"، "کی" موجود ہیں۔ جنھوں نے اپنی ماقبل ضمیروں اور اسموں کو محرّف کر دیا ہی)

(۳) وہ آیا

اُس کا بیٹا آیا

اُس کے بیٹے کا گھوڑا آیا

اُس کے بڑے بیٹے کا گھوڑا آیا

اُس کے بڑے بیٹے کے گھوڑے کا توبڑا لٹک رہا ہے۔

اُس کے بڑے بیٹے کے سبز رے گھوڑے کا توبڑا لٹک رہا ہے۔

اُس کے بڑے بیٹے کے سبزے گھوڑے کے توبڑے میں دانہ نہیں ہی۔

اُس کے بڑے بیٹے کے سبزے گھوڑے کے توبڑے میں دانہ کا نام نہیں۔

اُس کے بڑے بیٹے کے سبزے گھوڑے کے ملیے توبڑے میں چنے کے دلے ہُوئے دانے کا نام نہیں۔

رسمِ خط

جیسا کہ اوُپر بیان کیا جا چکا ہی جو لفظ مُختفی "ہ" پر ختم ہوتے ہیں واحد محرّف حالت میں اُن کی مُختفی "ہ" بدل کر "ے" ہو جاتی ہی۔ کتابت میں بھی اِس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

"اِمتحان میں جِتنے نمبر ایک اُمیّدوار حاصل کرتا ہی اُسی کے مطابق اُس کا درجہ قائم کیا جاتا ہی"۔

"وُہ دوسرے درجے میں کامیاب ہُوا"۔ امتحان کی کامیابی کے تین درجے مقرر ہیں"۔ بعضے لوگ بجائے "درجے میں" کے "درجہ میں" لکھتے ہیں اور جب اُن سے کہو کہ اِس کو "ے" کے ساتھ لکھنا چاہیئے تو کہتے ہیں کہ یہ لفظ تو عربی زبان کا ہے اور عربی میں "ے" سے نہیں لکھا جاتا! لیکن تماشا یہ ہی کہ وہی لوگ جب اُسی لفظ کو جمع میں استعمال کرتے ہیں تو "ے"

کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جیسے "تین درجے" "مکان کے سب دروازے بند تھے" کوئی پوچھے کہ جمع میں وہ عربیت یا فارسیت کہاں گئی؟

آواز کے مطابق کتابت نہ ہونے سے عبارت کے پڑھنے میں بعض وقت بڑی خرابی پیدا ہوتی ہے اور جب تک پہلے مطالعہ نہ کر لیجئے اُس کا صحیح پڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی مثال کے لئے دو جملے کافی ہوں گے۔

(۱) "وہ ایک بلند درجہ اور اعلیٰ خدمت پر فائز تھا"

(۲) "طویل محاصرہ اور اُس کی گوناگوں تکلیفوں سے سارا لشکر پریشان ہو گیا تھا"۔

ان دونوں جملوں میں عامل [پر (۱) اور سے (۲)] اپنے معمول اسموں [درجہ (۱) اور محاصرہ (۲)] سے دور جا کر ظاہر ہوئے ہیں اس لئے پڑھنے والا وہلہ اوّل میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اُسے درجہ اور محاصرہ پڑھنا چاہئے یا "درجے" اور "محاصرے"۔

اِن اسباب پر نظر کر کے میری رائے تو یہ ہے کہ اگر ے پر ختم ہونے والے لفظوں کے آخر میں محرّف حالت میں ے بڑھا دی جائے تو بہتر ہے جیسے "ضلعے" میں وغیرہ۔ لیکن خیر یہ نہ ہو تو نہ سہی، "درجہ میں" "پردہ کے پیچھے" کا غلط رسم خط ضرور ترک کیا جانا چاہئے۔

راحتستانِ ہاشمی

[از جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن)]

قال اللہ تعالیٰ عزّ و جلّ: یا ایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافّۃ

۱۔ آسماں ہیں شیشہ، میرا دیدۂ خوابیدہ ہے — جس کے پردوں میں نہاں صد عالمِ نادیدہ ہے
میں کہ اطمینان کا محروم جویا تھا یہاں — خواب، میری زندگی کی فرحتِ پوشیدہ ہے
چاہتا ہوں لطفِ تاریکی و تسکینِ خمار — بس کہ بیداری سے میری باصرہ رنجیدہ ہے
بادۂ اوہام میں شاید ملے کیفِ "کمال" — واقعیت سر سے پا تک نقصِ آشامیدہ ہے
حاسّہ، زندان ہے فکرِ قوی کے واسطے — ہوش، آزادی کے حق میں بندشِ پیچیدہ ہے
بے خطر پرواز کی ہے قدر و گنجائش کہاں — مُزدِ طیرانِ زغن یاں نعشِ ناپرسیدہ ہے!

سیرِ مطلق کی تمنا ہے تو سو جا ہم نشیں
جسم و "جسمانی" سے کر لے بے خبر اپنے تئیں

۲۔ اس فضائے خواب کو گلہائے نَو سے شاد کر — یعنی تاریکی میں بستی نور کی آباد کر
راحتِ بے قید کا انسان کی نقشہ بنا — نفسِ ظالم کی غلامی سے اسے آزاد کر
ملکِ راحت میں نہیں چلتی حکومت نفس کی — اس کو معزولِ جفا، محرومِ استبداد کر
نفسِ امّارہ کے معنی ہیں "سرشتِ آب و گل" ق — آب و گل کی اصلیت ہونی عدم سے یاد کر

گر وجودِ جاوداں ہے جامۂ خیر و کمال ق زیرِ پوشاکِ عدم نظارۂ اضداد کر
نفسِ بد ہے شور بوم مرگ و شر اس کھیت میں خیر پھلنے کی نہ تو اُمیدِ بے بنیاد کر

نفس کا محکوم رہ کر عقل و دانش پر نہ پھول
جلنے والے کے لئے تنویرِ آتش ہے فضول!

۳۔ "راحتستاں" میں مری وہ عقل ہے بے اعتبار صحنِ "معلومات" میں جو دوڑتی ہو طفل وار!
صیدِ نسیانِ حافظہ، مجروحِ نیشِ فعلِ حواس! ق ہیں یہی ارکان جن پر علم کا ہے انحصار
علمِ انسانی کی اس فاسد بنا پر عقل نے کاخ و ایواں جو کئے تعمیر سب نا استوار
جامِ حکمت میں ہے اس کے (عقل) کیفِ سوفسطائیت مست و لایعقل کیا محفل کو جس نے بار بار
پیرہن ہامان کا بھی زیب دیتا ہے اسے نفس کی کرے اگر درباراداری اختیار
رہنما بن کر اسے گو ٹوکتی رہتی بھی ہے درحقیقت شہسوارِ نفس کی ہے راہوار

پیروی اس مشتبہ رہبر کی آخر چھوڑ دی
یعنی عینک عقل کی اہلِ نظر نے توڑ دی!

۴۔ نفس بد آہنگ اور سازِ تعقل پر خلل راحتستاں کا مرے، قانون ہے حسنِ عمل!
ہے یہی وہ دل کش و دشوار راہِ مستقیم جس کا رہرو بے خبر منزل پہ آتا ہے نکل
ہے طلسمِ راحتستاں کی کلیدِ در یہی ہے اسی میں زندگی کے رازِ سربستہ کا حل
ہے یہی وہ جنتری جس کی شکنجِ بزم میں کھنچ کے ہو جاتا ہے سیدھا نفس کا ایک ایک بل
ہے یہی پودا، بہارِ جاوداں ہے جس کا پھول ہے یہی وہ پیڑ، عیشِ جاوداں ہے جس کا پھل
ہے اسی آرائشِ ظاہر کے اندر مندرج وہ سرورِ باطنی، یعنی بہشتِ بے بدل

ہاشمی کے خواب کی شاید یہی تعبیر ہو
کیا عجب ہے راحتستاں "سِلم" کی تفسیر ہو؟

عالمِ ڈراما

(۱) یونان

(از جناب محمد عمر صاحب بی اے۔ صدر مترجم لامیر کونسل عالیہ۔ جموں کشمیر)

اُس زمانہ میں جب یورپ بلکہ ایشیا کے کثیر حصہ پر جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، علم و فضل کا آفتاب افقِ یونان پر چمک رہا تھا۔ فلسفہ، الٰہیات، ہندسہ اور نجوم سے وسیع علوم کے پہلو بہ پہلو فنونِ لطیفہ نشو و نما پا رہے تھے جن کی حکمائے یونان نے آٹھ قسمیں مقرر کی تھیں (۱) ڈراما (۲) نظم (۳) خطابت (۴) موسیقی (۵) سنگ تراشی (۶) مصوری (۷) معماری اور (۸) باغبانی۔

ڈراما (ڈراما یونانی لفظ Drao سے مشتق ہے جس کے معنی کام کرنے اور ایکٹ کرنے کے ہیں) یہ دراصل نظم کی ایک صنف تھا مگر رفتہ رفتہ اسے وہ اہمیت حاصل ہوئی کہ بجائے خود ایک فن بن گیا۔ خواہ اسے تفننِ طبع کے سامان کا تقاضا کہئے یا مذہبی عنصر کی برکت خیال کیجئے بہر حال ڈراما تمام دیگر فنونِ لطیفہ سے گوئے سبقت لے گیا اور یونانی تمدن پر ایسا چھایا کہ بغیر اس کے ذکرِ خیر کے یونان کی تاریخ ادھوری رہ جاتی ہے۔

ڈراما کی اقسام ڈراما افعالِ انسانی کی جیتی جاگتی متحرک نمایش کا نام ہے۔ اس میں مسلسل اور روح پرور گفتگو سے داستان یا پلاٹ پیدا ہوتا ہے اور تذکرہ یا حکایت راویانہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ ٹریجڈی (داستانِ غم) اور کومیڈی (داستان بہجت) اس کی دو اہم قسمیں ہیں۔

ٹریجڈی اور کومیڈی کی نوعیت ابتدا میں ٹریجڈی سے فقط رسوم مذہبی کا انصرام مدنظر ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں انسان اور اس کے افعال کی آئینہ برداری اس کے سپرد ہوئی یہ عام خیال صریحاً غلط ہے کہ ٹریجڈی کا انجام لازماً کیرکٹروں کی موت پر ہونا چاہیئے۔ افلاطون کے نزدیک ہر وہ سنجیدہ ڈراما جس میں دیو مالا کے کسی ہیرو کے مصائب کا بیان یا کسی قومی ادبار یا جہان کشائی کا تذکرہ ہو ٹریجڈی ہے

ارسطو کا قول ہے کہ " ٹریجڈی کسی کارنامہ کی سنجیدہ، متین، مکمل اور مناسب حال نقل ہے جس میں عفو و کرم اور جبر و جور کا مآل دکھا کر نفس کی اصلاح و فلاح مقصود ہوتی ہے۔ ٹریجڈی کے کرکٹر سوسائٹی کے متوسط طبقہ سے بلند تر پایہ کے اور کومیڈی کے اس سے کمتر درجہ کے ہونے چاہئیں۔ نیک نہاد لوگوں کو مصیبت کے گرداب میں ڈالنا خواہ کتنا ہی الم ناک کیوں نہ ہو ٹریجڈی کی منزلت نہیں رکھتا اور کسی بدمعاش کو اس کے کیفر کردار کو پہونچانا ممکن ہے کہ از بس سبق آموز ہو مگر اسے ٹریجڈی سے کوئی لگاؤ نہیں ہوسکتا۔ ٹریجڈی میں لابدی ہے کہ جو بلا کسی کے سر آئے وہ قطعاً ناواجب اور غیر معمولی ہو۔ مگر باوجود اس کے حوادث کی علت غائی ایسی واضح ہو کہ جب ہم واقعہ پر متاسف ہوں تو ساتھ ہی یہ بھی محسوس کریں کہ وہ واقعہ کسی اور طریق سے یا کسی اور اسلوب پر ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔"

آر ایس کوپل سٹن بھی افسوس ناک انجام کو ٹریجڈی کے لوازمات میں شمار نہیں کرتے۔ اے ڈبلیو شلگل اپنی معرکۃ الآرا تصنیف موسومہ "فن و ادبیات ڈراما" میں ٹریجڈی اور کومیڈی کے بارے میں کیا خوب کہتے ہیں:-

" ٹریجڈی تخیل کا معراج کمال اور کومیڈی اس کا بازیچہ ہے۔"

جے ایس، کلٹف، اپنی تصنیف لطیف "ڈراما نگاران برطانیہ" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:-

" ٹریجڈی کا تعلق فطرت انسانی کے عمیق اور افضل اور حقیقت آشنا پہلو سے ہوتا ہے۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں جو مصائب رونما ہوتے ہیں، انھیں عملی طور پر دکھا کر ہمدردی اور دل سوزی کے جذبات کو متحرک کیا جائے۔ اس کے برعکس کومیڈی میں روزمرّہ کے ایسے معمولی واقعات ہوتے ہیں جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں":-

کومیڈی بنی نوعِ انسان کی مضحکہ خیز سہو و خطا، اس کی فروگزاشتوں اور خامیوں کو حاضرین کی تفریح طبع کے لئے پیش کرتی ہے۔ ٹریجڈی قلب انسانی کے بہترین جذبات کو متاثر کرتی ہے اور کومیڈی اپنے رندانہ اور مستانہ انداز میں مزے مزے کی چٹکیاں لیتی ہے۔ کومیڈی دکھ درد، سنجیدگی اور متانت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اور ٹریجڈی عیش و نشاط، لہو و لعب، خوش طبعی اور دل لگی کی روادار نہیں۔ ٹریجڈی اُن لوگوں کی حالت کا آئینہ ہوتی ہے جو تنازع بقا کی اُلجھنوں میں پھنسی ہوئی تقدیر سے لڑائی ٹھانتے ہیں اور تلاطم حیات میں تنکے کا سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ کومیڈی ایسے اشخاص کا مرقع پیش کرتی ہے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر من مانی رنگ رلیاں مناتے ہیں اور

جن پر دن رات کچھے گھڑے کی چڑھی رہتی ہے۔"

دورِ حاضرہ میں ٹریجڈی ایسے تذکرہ کی حامل ہے جس میں دردانگیز واقعات بیان کرکے خیالات کو ملند، نظر کو وسیع اور دل کو کشادہ کیا جاتا ہے اور کومیڈی ایسے داستانوں کی سرمایہ دار ہوتی ہے جس میں ہذل و ظرافت کے ذریعہ رسوم بد اور عادات ذمیمہ کی کھلی اُڑائی جاتی ہے۔ اس تمہید کے بعد ہم یونانی ڈراما کی ارتقائی اور تاریخی حیثیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یونانی ڈراما کی ابتدا

محققین کی رائے ہے کہ باقاعدہ ایجاد سے بہت پہلے اہل یونان کی طبائع میں ڈراما کا عنصر موجود تھا اور اس کی شہادت اُن مذہبی رسوم سے ملتی ہے جنھیں اسرار برزخ کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی پوجا تھی جس میں پوجاری ڈمیٹری Demeter اور سیرس Ceres نامی دو دیوتاؤں کے معجزات اور سوانح حیات ان کا بہروپ بھر کر بیان کرتے اور اعراف، دوزخ اور بہشت کے نظارے دکھا کر حیاتِ بعد الموت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچتے تھے اور اُس سے تلقین و تبلیغ کا کام لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی باکس[1] پوجا رائج تھی۔ لیکن اس میں ادائے فرائض مذہبی کے علاوہ قومی اور اقتصادی بہبودی کی دعائیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ باقاعدہ ڈراما کا سرچشمہ یہی باکس پوجا ہے۔

ڈورین اور آئی اونین

یونان کی آبادی زیادہ تر دو مقتدر قوموں پر مشتمل تھی جن میں ایک کا نام ڈورین (Dorian) اور دوسری کا آئی اونین (Ionion) تھا۔ اول لذکر ایک سرفروش اور جنگ جو قوم تھی۔ ضرب و حرب کی باتیں اُن کی طبائع میں اس قدر رچ گئی تھیں کہ اُن کی بزم پر رزم کا دھوکا ہوتا تھا۔ ڈورین موسم بہار کے آغاز میں باکس پوجا کا تیوہار بڑی دھوم دھام سے منایا کرتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے اپنے رقص و سرود پر سپاہیانہ رنگ چڑھا کر ایسا مسخ کر دیا کہ ان کا ناچ فوج کا کوچ ہو گیا اور ان کا گانا سُن کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی رجز پڑھ رہا ہے۔ ان کے گیت بالکل وحشیانہ ہوتے تھے۔ جن کی تصنیف کسی اصول

---

[1] باکس (Bacchus) لاطینی دیوتا کو یونانی ڈائونی سس Dionysis کا مرادف قرار دیتے ہیں حالانکہ باکس صرف شراب کا دیوتا ہے اور ڈائونی سس ان صفات کا مظہر ہے جو ہندوستانی دیوتا برہما سے منسوب کی جاتی ہیں یعنی وہ موجودات عالم کا خالق ہے۔۱۲

یا قاعدہ کی دست نگر نہ تھی۔ جب آئی اونین اُن کے ساتھ آباد ہوئے تو انھوں نے باکس پوجا میں اپنے گیت بھی شامل کردیئے۔ جنھیں وہ اپنی زبان میں ڈیتی رمیب Dethyramb کہتے تھے۔ ان میں بھی تال اور سُر کا نشان تک نہ تھا۔ جو لوگ باکس پوجا میں ناچتے گاتے تھے، اُنھیں کورس کہتے تھے۔

ایری ان ۶۰۰ قبل مسیح ARION کورنتھ کے ایک شاعر اور مغنی ایری ان نامی نے ان گیتوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور ٹریجک کورس[1] ایجاد کیا جن میں چند اشخاص جن کی تعداد پچاس کے قریب ہوتی تھی باکس کے حواری بنتے تھے اور بکرے کی کھالیں اوڑھ کر گاتے بجاتے قربان گاہ کا طواف کرتے تھے اس سے فارغ ہوکر ایک بکرا قربانی دیا جاتا تھا۔ اس قربانی کے بکرے اور کھالوں کے ملبوس کی نسبت سے ان گیتوں کو ٹریجڈی[2] یعنی بکرے کا گیت کہتے تھے۔ اس طرح باکس پوجا سے ٹریجڈی نے جنم لیا۔

تھس پس ۵۳۵ قبل مسیح THESPIS ۵۳۵ قبل مسیح میں یونان کے ایک سر برآوردہ شاعر اور ڈراما کے موجد تھس پس نے باکس پوجا کا ایک نیا باب کھول کر حقیقی ڈرامہ کا ڈول ڈالا۔ کورس کے مسلسل گانے سے انقباض خاطر پیدا ہوتا تھا اور خود گویئے لگاتار گاتے گاتے تھک کر چُور ہو جاتے تھے۔ اس نقص کو رفع کرنے کے لئے تھس پس نے یونانی دیومالا سے چند پلاٹ لے کر چند کہانیاں ڈراما کی طرز پر تصنیف کیں جن میں وہ خود یا کوئی اور شخص ایک چھوٹے سے تختہ پر کھڑا ہوکر تماشائیوں کو سناتا تھا اور کورس کو دم لینے کا موقع ملتا تھا۔ ان کہانیوں کو ایپی سوڈ Episode کہتے تھے۔

فری نکیس PHRYNICUS تھس پس نے جس اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا اسے وہ کماحقہ انجام پر نہ پہونچا سکا اور اس کے ایک شاگرد رشید فری نکیس نے اس بیل کو منڈھے چڑھانے کا تہیہ کیا۔ باکس کی رام کہانی سُنتے سُنتے سامعین کے کان پک گئے اور دلچسپی کا فقدان تنافر کی حد تک پہونچنے کے قریب تھا۔ یہ نقشہ دیکھکر فری نکیس کی جدّت طراز طبیعت نے باکس کے محامد کو بالائے طاق رکھ کر نو ٹریجڈیاں تصنیف کیں۔ جو یکے بعد دیگرے پبلک کو دکھائی گئیں۔ لیکن کورس برابر جاری رہا۔ کورس یا ایپی سوڈ میں ابھی تک عورتوں کو

---

[1] کورس کے لغوی معنی رقص یا گروہ رقاصان ہے ۱۲ [2] یونانی میں Trogas بکرا اور Ode گیت کے معنی رکھتا ہے ۱۲

شامل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ فری نیکس نے اس قید کو بھی اُڑا دیا اور عورتوں کو یہ فرائض تفویض ہونے لگے۔

اس زمانہ میں یونانیوں کے سر پر عجب وغرور کا ایسا بھوت سوار تھا کہ وہ کسی ایسی بات کا سُننا گوارا نہیں کرتے تھے جس سے اُن کی کسرِشان ہوتی۔ ایسے ناموافق ایام میں فری نیکس کی ٹریجڈی "گرفتاری ہبوط مالی ٹس" دکھائی اور سُنائی گئی۔ اس ٹریجڈی میں یونانیوں پر خوب لعن وطعن کی گئی تھی۔ بس پھر کیا تھا محفل میں کہرام مچگیا۔ چاروں طرف سے رونے پیٹنے کی صدائیں آنے لگیں اور ٹریجڈی بند کی گئی۔ مقدمہ چلا اور فری نیکس پر ایک ہزار درہم جُرمانہ ہوا۔ اور ٹریجڈی مذکور ضبط کی گئی۔ جب کھیل بگڑتا نظر آیا تو فری نیکس نے ایک اور ٹریجڈی تیار کی اور اُس میں یونانیوں کی تعریف خوب دل کھول کر کی۔ اس ٹریجڈی نے وہ قبول عام حاصل کیا کہ معرکہ تھرما پولی کے ہیرو نے اس میں پارٹ لیا اور پھر فری نیکس یونانیوں کا چاہیتا شاعر بن گیا۔

ایسی کائی لس
ASECHYLUSS

یونان کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے ڈرامہ کی اصلاح میں بہت کارہائے نمایاں کئے اور جس طرح تھس پس فن ڈرامہ کا موجد ہے اسی طرح باقاعدہ ٹریجڈی کی داغ بیل ڈالنے کا سہرہ ایسی کائی لس کے سر ہے۔ اُس نے کورس کو بہت حد تک عضو معطل کر کے مکالمہ کا جزو اعظم بنایا۔ اس سے قبل صرف ایک ایکٹر آکر تقریر کر جایا کرتا تھا۔ اس نے دو ایکٹروں کا ایک وقت میں موجود ہونا لازم قرار دیا اور اس بات پر مصر ہوا کہ ہر ایکٹر اپنے کیرکٹر کی شان کے مطابق کپڑے پہن کر پیش ہوا کرے۔ یہ شاعر ستر ٹریجڈیوں کے مصنف ہونے کے علاوہ خود ایک باکمال ایکٹر تھا۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ وہ ایسا مہیب مصنوعی چہرہ مُنہ پر چڑھا کر اپنی ایک ٹریجڈی میں پارٹ کرنے کے لئے نکلا کہ اسے دیکھکر کئی بچے دہل کر مر گئے اور متعدد عورتوں کے حمل گر گئے۔ اس کے ڈراموں میں سے صرف سات دست برد زمانہ سے محفوظ رہے ہیں۔ باقیوں کے صرف نام رہ گئے نشان نہیں ملتا۔

اس کے ڈرامے بہت دہشت ناک اور ڈراؤنے ہوتے تھے۔ لیکن جس طرح بچے جنوں بھوتوں کی کہانیاں سُن کر سہم جاتے ہیں مگر اس پر بھی انھیں شوق اور اصرار سے سُنتے ہیں۔ یہی صورت ان ڈراموں اور اہل یونان کی تھی۔ دینی پیشواؤں کی تضحیک و تذلیل اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ سربازار انھیں جلی کٹی سناتا اور ان کی نقلیں بنا کر رسوا کرتا پھرتا تھا۔ ایسی کائلس نہ صرف شاعر اور نامور ایکٹر تھا بلکہ قلم کی طرح اس کی تلوار بھی

جب چلتی تھی تو قیامت برپا کر دیتی تھی۔ لیکن جب ٹریجڈی نویسی کا انعام ایک پبلک جلسہ میں اس کے حریف اور ہم عصر شاعر سوفوکلیس کو دیا گیا تو ایسی کائی لس دل برداشتہ ہو کر کہیں چلا گیا۔

سوفوکلیز SOPHOECLES

ڈرامہ میں ابھی بہت کچھ مزید اصلاح کی ضرورت تھی اور یہ کام قدرت نے سوفوکلیز کے لئے ودیعت کر رکھا تھا۔ اس نے یونانی اسٹیج پر بے شمار نئی باتیں رائج کیں اور یہ قاعدہ مقرر کیا کہ اسٹیج پر ہمیشہ بجائے دو کے تین ایکٹر موجود ہوا کریں اور ان کا لباس پر تکلف ہو۔ سوفوکلیز نے ۱۶ سال کی عمر میں ڈراما نگاری شروع کی اور کل ایک سو تیس ڈرامے لکھے۔ سوفوکلیز نے اوڈے پس Oedipus کے متعلق جو تین ٹریجڈیاں لکھیں وہ اس لحاظ سے قابل غور ہیں کہ ان کا اثر یورپ کے ڈراما پر پڑا۔ اوڈے پس کی ٹریجڈی میں یہ کہانی ہے کہ ایک بیٹا اپنی سگی ماں سے شادی کر لیتا ہے۔ اور اپنے بیٹوں کا بھائی اور باپ، اپنی ماں کا خاوند اور بیٹا اور اپنے باپ کا رقیب اور قاتل بن جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یونانی جو تہذیب کے مشعل بردار ہونے کا دم بھرتے تھے کس طرح اس قابل نفرت ٹریجڈی کی نمائش کو روا رکھتے تھے۔ ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم خود ارسطو کو اس ٹریجڈی کی تعریف میں رطب اللسان پاتے ہیں جو اسے ٹریجڈی کا بہترین نمونہ قرار دیتا ہے۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر حیرت انگیز یہ امر ہے کہ روم قدیم میں سینکا، مہذب فرانس میں والیٹر اور ثقاہت پسند انگلستان میں ڈرائیڈن جیسے برگزیدہ آدمیوں نے اسی مضمون کی ٹریجڈیاں لکھنے پر فخر کیا ہے آسٹریا کے مشہور سحر نگار اور زمانہ حال کے سربرآوردہ ڈراما نویس ہوگو فان ہوم منستال Hugo Von Hofmansthal کی تاج شہرت کا سب سے زیادہ چمکدار الماس یہی کومیڈی ہے۔ سچ ہے کہ تہذیب کا کوئی معیار نہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سوفوکلیز لچا، شہدا تھا، بلکہ اس کے چلن کی پاکیزگی پر کوئی حرف نہ رکھ سکتا تھا سوفوکلیز نے عالم پیری میں بھی قلم ہاتھ سے نہ چھوڑا اور برابر ٹریجڈیاں لکھتا رہا۔ جب اس کی عمر سو سال سے تجاوز کر گئی تو اس کے ایک ناخلف بیٹے نے یہ تہمت تراشی کہ اس کے حواس میں خلل آگیا ہے۔ سوفوکلیز نے عدالت کے روبرو اپنی جواب دہی میں اوڈے پس کی تیسری جلد جو اس کی تازہ تصنیف تھی پیش کی اور عدالت نے قرار دیا کہ جو شخص ایسی کتاب تصنیف کرنے پر قادر ہے اسے کوئی پاگل ہی مجنوں کہے گا۔

یوروپیڈیز اِس زمانہ میں یوروپیڈیز شاعر نے بھی علم اُستادی بلند کر رکھا تھا۔ حکیم سُقراط سے اِس کے تعلقات دوستانہ تھے۔ (EUREPIDES.) جس حکیم کے بارہ میں راوی کہتا ہے کہ اِس نے عمر بھر کبھی تھیٹر جانے میں ناغہ نہیں کیا۔ یوروپیڈیز نے اُس زمانہ کے مذاق کے مطابق ۷۵ ڈرامے لکھے اور وہ پہلا شاعر ہے جو فلسفیانہ باتوں کو اسٹیج پر لایا۔ مشہور عالم مقدر ڈی ماسٹینز اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس ٹریجک شاعر کی موت بھی ٹریجک ہی ہوئی۔ یعنی شکارگاہ میں شکاری کُتّوں نے اُسے تکہ بوٹی کر ڈالا۔

جنگ سسلی میں اِس کے اشعار یونانی سپاہیوں کے آڑے آئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب نسی اس (NICIAS) کی زیر قیادت یونانی فوج نے شکست کھائی تو فاتحوں نے ان پر وحشیانہ اور بہیمانہ ستم ڈھائے۔ مگر اُن یونانیوں کا بال تک بیکا نہ ہوا جو یوروپیڈیز کا ایک مصرع تک سُنا سکتے تھے گویا اس کا کلام پروانہ رستگاری تھا۔ یونان کا یہ قابل احترام شاعر فوج کا جنرل اور معزز باشندہ اخیر عمر تک سٹیج پر آکر پارٹ کرتا رہا۔

ان تین ہم عصر شعرا کے بارہ میں کونٹیلین (Quintilian) کی یہ رائے ہے کہ "ایس کائی لس پُرشکوہ وجسارت پسند سوفوکلیز ثقہ و پُروقار اور یوری پیڈیز فصاحت کا بحر بیکراں تھا۔"

سکندر اعظم سکندر اعظم کے عہد حکومت سے قبل ایتھنز میں ۱۴۰۰ سو ٹریجڈیاں تصنیف ہو چکی تھیں۔ سکندر کے زمانہ میں سکندریہ علم و ادب کا مرکز اور ڈراما کا مستقر بن گیا۔ اکثر محققین کا قول ہے کہ فن ڈراما سکندر اور اُس کے باپ کے حکومت کے زیر اثر یورپ اور ایشیا میں پھیلا، کیوں کہ جب وہ کسی ملک کو تسخیر کرتے تو وہیں ڈراما کر کے جشن منایا کرتے تھے۔ اور اس طرح وہاں کے باشندوں کو ڈراما کی چاٹ لگا آتے تھے۔ جب سکندریہ نے علم پروری کا پھریرا اُڑایا تو یونان کے تمام شاعر اسی جگہ اُمنڈ کر آگئے، اور فن ڈراما کو اوج کمال پر پہونچایا۔ ان شعرا میں سے سات کو جو سبع سیارہ کے نام سے مشہور ہیں ٹریجڈی لکھنے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ انھوں نے ٹولمی (بطلیموس) اور فلاڈلفس (Ptolmy and Philadelphus) کے عہد یعنی ۲۸۳ و ۲۴۷ قبل مسیح کے مابین بے شمار ٹریجڈیاں لکھیں اور ان کا تماشہ کیا۔ قیاس چاہتا ہے کہ عربوں میں سبع معلقہ کا خیال انھیں سبع سیارہ سے پیدا ہوا۔

ازاکیل ۱۰۰ برس قبل مسیحؑ حزقیل یہودی نے یونانی زبان میں ایک ڈراما لکھا اور مذہبی ڈراما کا طرح انداز AEZEKIEL ہوا۔ اس ڈرامے میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور فرعون کی کشمکش اور قوم اسرائیل کی ہجرت کے واقعات دکھائے گئے ہیں۔ اس ڈرامے کی تصنیف سے حزقیل کا یہ مدعا تھا کہ یہود کو ایک مثیل موسیٰؑ کی آمد کا نوید سُنا کر ان کا حوصلہ بڑھائے اور ان کے لوح دل پر یہ نقش کر دے کہ یہ غلامی کی ذلت کوئی دن کی بات ہی۔ جب حضرت موسیٰؑ پھر اس عالم فانی میں تشریف لائیں گے تو سب فراعنۂ زماں خاک میں مل جائیں گے۔ اس ڈرامے کے اہم کریکٹر حضرت موسیٰؑ، فرعون اور وہ ہستی ہی جس نے طور پر جلوہ دکھایا۔ ڈرامے کے آغاز میں حضرت موسیٰؑ ساٹھ سطر کی ایک تقریر کرتے ہیں۔ اور ان کا عصا سانپ بن جاتا ہی۔ گو اس ڈرامے کے صرف چند اوراق پریشان دستیاب ہوتے ہیں، لیکن یہودی ابھی تک مثیل موسیٰؑ کی خواب دیکھ رہی ہیں۔ یہ اعتقاد ان کی اقتصادی ترقی کے کس قدر حائل ہُوا، محتاج بیان نہیں۔

(کومیڈی)

کومیڈی کی ابتدا ٹریجڈی اور کومیڈی اس لحاظ سے توام ہیں کہ دونوں کا مبدأ باکس پوجا ہی لیکن باوجود اس قرابت کے ان کی آفرینش بالکل مختلف اور جُداگانہ طریقوں سے ہوئی۔ ٹریجڈی اس باکس پوجا کی یادگار ہی جو کڑاکے کی سردیوں میں کی جاتی تھی۔ یونان میں یہ موسم بہت جانکش خیال کیا جاتا تھا۔ نمو کی قوّت سلب ہو جانے سے نہ صرف پُربہار باغوں اور مرغزاروں پر اوس پڑ جاتی تھی بلکہ سبزی ترکاری بھی آگ کے مول ملتی تھی۔ اس حالت سے جو افسردگی و اُداسی کا ہجوم ہوتا تھا۔ وہ ٹریجک کورس کے ترانوں سے پھُوٹ کر نکلتا تھا۔ اس کے برعکس کومیڈی اپنی تخلیق کے لئے اس باکس پوجا کی مرہون منت ہی جو نکلتے جاڑے میں کی جاتی تھی۔ جب درخت زعفرانی پوشاک اُتار کر دھانی جوڑا پہنتے ہیں اور زمین پر سبز مخمل کا فرش بچھ جاتا ہی۔ گویا یہ موسم ان تمام خوبیوں کا حامل ہوتا تھا جو بہار سے منسوب کی جاتی ہیں۔ یہی دن ہندوستان میں ہولی منانے کے ہیں۔ اور جو کچھ ہولی میں ہوتا ہی وہی عالم یونان کا تھا۔ ابتدا میں مہذب شہریوں کی تازگی طبع کا باعث ٹریجڈی اور جاہل دیہاتیوں کی تفریح کا سامان کومیڈی ہوا کرتی تھی۔ شہر میں

ٹریجڈی بکمال تقدس اور خلوص سے کی جاتی تھی۔ دیہات میں دہقانی فصل پکنے پر باکس کی پوجا کرکے اظہار تشکر کرتے تھے۔ اس تہوار کا نام اسکولیا (Ascolia) تھا۔ ورجل اس کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے:
"اس موقع پر ایک بکرا باکس کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ جس کے بعد لوگ گلی کوچوں میں شراب کے نشہ میں چور دیوانہ وار پھرتے تھے"۔ جو گیت وہ گاتے تھے انھیں فیلک (Phallic) کہتے تھے۔ ان گیتوں میں باکس کی حمد و ثنا کے علاوہ مختلف لوگوں کی شخصیت کا مضحکہ بھی اُڑایا جاتا تھا۔ غرض کہ یہ ہجوم باکس کا بُت اُٹھائے گاتے بجاتے، ناچتے کودتے گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے لوگ حد اعتدال سے گزر جاتے تھے، تو کومس کا فائدہ انھیں وہ کھری کھری سُناتا تھا کہ ان کا سب نشہ ہرن ہو جاتا تھا۔ اسی اسکولیا سے کومیڈی نکلتی ہے کومیڈی یونانی لفظ کومس سے (Comus) مشتق ہے جس کے معنی (دیہاتوں کا گیت) ہیں۔ دوسرا مصدر لفظ کومی (Kome) بیان کیا جاتا ہے جس کے معنی گاؤں کے ہیں مگر اوّل الذکر زیادہ مستند ہے۔

سوسیرین SUSARION جب تھسی پس ٹریجڈی کی بزم آرائی میں مشغول تھا میگیرا (Megara) کے شاعر سوسیرین نے کومیڈی کا بازار گرم کیا۔ گو ٹریجڈی اور کومیڈی ایک ہی وقت پر منظر عام پر آئیں لیکن کومیڈی کو فن کا رتبہ حاصل کرنے میں بہت مدت لگی۔ سوسیرین لوگوں کے عیب اور بیہودگیاں سٹیج سے ظاہر کرکے کومیڈی کا موجد بنا۔ کومیڈی کے ساتھ نقلیں بھی کی جاتی تھیں۔

کریٹینس CRATINUS یہ شاعر ۵۱۹ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اور ۴۲۳ قبل مسیح میں فوت ہوا۔ یہ بہت منچلا ہجو گو تھا اور لوگ اِس کی سیاسی ہجوؤں کو بہت پسند کرتے تھے۔ سوسیرین پہلا شاعر ہے جس نے کومیڈی کو ذاتی حملوں کے لئے خوفناک آلہ اور لوگوں کے عیوب کا سخت گیر محتسب بنایا۔ جب کومیڈی اور ہجو کے بادشاہ ارسٹوفینز نے اِس پر "مدہوش میخوار" کی پھبتی کہی تو اس نے اس طنز کو بہت محسوس کیا اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ایک کومیڈی تصنیف کی جس کا نام اس نے بوتل رکھا۔ جب ارسٹوفینز کی کومیڈی (بادل) اور اس کی کومیڈی (بوتل) سٹیج پر آئیں، تو "بوتل" نے "بادل" کے دھوئیں بکھیر دیئے۔

یوپولس EUPOLIS ارسٹوفینز کا دوسرا مدِّمقابل یوپولس تھا۔ جو ۴۴۵ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اور ۴۰۰ قبل مسیح میں

فوت ہوا۔ اس نے بہت سی ہجو یہ کومیڈیاں لکھیں جن میں سے ایک کی پاداش میں اسے سمندر میں پھینک دیا گیا۔ شکوہ آمیز الفاظ اور پاکیزگیٔ زبان کے لحاظ سے وہ واقعی ارسٹوفینز کا ہم پلہ ہی۔

کریٹس CRATIS کریٹس ایک نغز گو شاعر ہر دلعزیز مصنف اور قابل ایکٹر تھا۔ یہ کریٹینس کا ہم نوالہ وہم پیالہ تھا اور اس نے کریٹینس کی تمام کومیڈیوں میں پارٹ کیا تھا۔ یہی مصنف سب سے پہلے شرابیوں کو سٹیج پر لایا۔ اپنی کومیڈیوں میں سیاسی معاملات کا ذکر کرنے سے وہ پہلو بچاتا تھا۔ ایسی کومیڈیاں جو سیاسیات میں دخل دیں قانوناً ممنوع کی گئی تھیں۔ لیکن یہ حکم ایک سال تک نافذ رہا۔ بعد میں منسوخ کیا گیا۔ جب کومیڈی ناقابل برداشت طور پر فحش ہو گئی تو علما نے اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور ان میں سے تمام قابل اعتراض اور حیا سوز باتیں نکال کر ان کے بجائے تقریریں اور گیت ڈال دیئے۔ اسی طرح کومیڈی کی زبان ہزلیات اور فواحش سے پاک ہو گئی۔

ارسٹوفینز ARISTOPHANES حقیقی کومیڈی ۴۲۵ قبل مسیح کے قریب ارسٹوفینز کے قلم سے رونما ہوئی۔ زمانہ حال کے نقادوں کی نگاہ میں اس کی تصنیفات بھی غیر مہذب ہیں۔ گو یہ اعتراض بہت حد تک بجا ہی لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس نے اپنی کومیڈیاں ایتھنز اور سپارٹا کے طویل جنگ کے زمانہ میں تصنیف کی تھیں۔ ایتھنز کی جماعت عمومی کا سرگروہ (Cleon) کلی آن اس کا جانی دشمن تھا۔ اور حکومت ایتھنز میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اسی کے وجود سے منسوب کی جاتی تھیں۔ یہ ڈراما نگار صلح کا حامی تھا اور کلی آن جنگ کا علمبردار تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جن خیالات کا اظہار کسی پبلک جلسہ میں کرنا خطرناک متصور ہوتا انھیں ایکٹر سٹیج پر کھلے الفاظ میں بیدھڑک بیان کر جاتے تھے۔ جب کلی آن کے مخالفوں نے حمایت کا عہد کیا تو ارسٹوفینز نے ایک کومیڈی موسومہ نائٹ (Knight) تیار کی اور اس میں کلی آن کی وہ گت بنائی کہ تو بہ بھلی۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ خود ارسٹوفینز نے اس کیرکٹر کا پارٹ کیا جس سے کلی آن مراد تھا۔ اس کی مابقی کومیڈیاں بھی حکومت کی خرابیوں کے انکشاف کے لئے وقف ہیں۔ اس کی جولانیٔ طبع دوست دشمن تو کجا خود اس کی ذات کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ جو کچھ کہنا ہوتا تھا وہ کہہ گذرتا تھا۔ خواہ اس میں کسی کی دل آزاری ہو یا اپنی بدنامی۔ سقراط کی سی قابل احترام ہستی جس کی دوستی پر ارسٹوفینز ناز کیا کرتا تھا اس کی نکتہ چینی سے

نہ بچ سکی۔ جب شاہ ڈائی آنی سس (Dionysis) نے ایتھنیز کی زبان اور تمدن سے آگاہ ہونے کی خواہش ظاہر کی تو افلاطون نے اسے ارسٹوفینز کے ڈرامے بھیج کر کہا کہ ان میں اہل ایتھنیز کی صحیح تصویر نظر آئے گی۔

یوبولس۔ انٹی فینز اور ایلکلنز — ارسٹوفینز کے بعد یوبولس۔ انٹی فینز اور ایلکلنز نے بے شمار کومیڈیاں لکھیں۔ صرف آخر الذکر نے جو ۳۹۴ میں پیدا ہوا اور ۲۸۸ قبل مسیح میں فوت ہوا، ۲۴۰ کومیڈیاں لکھیں۔ اس کی تصنیفات فصاحت و بلاغت کی کان ہیں۔ یہ شاعر ۱۰۶ سال کی عمر میں فوت ہوا اور اخیر دم تک ڈراما لکھنے میں مصروف رہا۔

مینانڈر — ایلکلنز کا برادرزادہ مینانڈر ایک بلند پایہ ایکٹر اور کامیڈی نویس تھا اس زمانہ کی کامیڈیو MENANDER میں تمدنی اور معاشرتی باتوں کا ذکر ہوتا تھا۔ ہجو کا عنصر گو مفقود نہیں ہوا تھا مگر بہت کم ہو گیا تھا۔ اور اس کی جگہ حسن و عشق کی کرشمہ سازیوں نے لے لی تھی۔ مینانڈر نے (۳۴۲-۲۹۱ قبل مسیح) اعلیٰ طبیعتوں کے لئے متعدد کامیڈیاں لکھکر اس کا پایہ بلند کر دیا یہ شاعر لذات نفسانی کے موید Epicurus ایپی کیورس کا دوست اور اُس کا ہمنوا تھا۔ اسی لئے ایپی کیورس کے مذاق اور عقیدہ کی جھلک اس کی تصنیفات میں پائی جاتی ہے۔ مینانڈر کے ڈرامے سراپا تہذیب ہونے کے علاوہ بہت دلچسپ اور فصیح ہیں۔ اِس کا مدعا یہ تھا کہ نیکی کا ثمر اور بدی کا مآل سبق آموز طریق پر دکھائے۔ وہ فطرت انسانی کا چابکدست مصور تھا۔ کوئن ٹن اس کے اس کے ڈراموں کو فصاحت کے مدرسہ کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ فطرت نگاری میں اس کو وہ ملکہ حاصل تھا کہ نقاد کو اس کے ڈراموں کے مطالعہ کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا مینانڈر کے ڈرامے فطرت کا عکس ہیں یا خود فطرت اِن ڈراموں کی وضع پر ڈھالی گئی ہے۔

فیلی مان — فیلی مان مینانڈر کا ہم عصر تھا اور مد مقابل۔ لیکن اس نے متقدمین کی طرح عوام کے لئے Phileman کامیڈیاں لکھیں۔

یونانی کومیڈی کے تین اقسام — یونانی کومیڈی کے تین اقسام۔ قدیم[1]۔ وسطیٰ[2] اور جدید[3] ہیں۔ کامیڈی قدیم اُس زمانے کی کومیڈی کو کہتے ہیں جب کریکٹر حقیقی شخص ہوتے تھے اور اصلی ناموں سے سٹیج پر لائے

جاتے تھے۔ اس میں بہت دل آزاری سے کام لیا جاتا تھا۔ اور دل کھول کر مذمت کی جاتی تھی۔ اس قسم کے ڈرامے آخر کار ناقابل برداشت ہوگئے۔ یوبولس کریٹس اور ارسٹوفینز اس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ شعرا کسی بدمعاش چور اُچکے، زناکار، قاتل، کسی بداطوار کی خبر لینے میں تسمہ نہیں لگا رکھتے تھے

کومیڈی وسطیٰ میں حقیقی کومیڈی کی طرح اخلاق وعادات کے نقشے دکھائے جاتے تھے۔ لیکن ذات کا ذکر یا زندہ کیرکٹروں کا نام لے کر صلواتیں سُنانا خارج کر دیا گیا تھا۔ اور فرضی ناموں سے کام لیا جاتا تھا۔

کومیڈی[3] جدید فن کی انتہائی منزل ہے۔ جو موجودہ کامک ڈراما سے لگا کھاتی تھی۔ جس میں کیرکٹر محض فرضی ہوتے ہیں۔ صرف یہ ضروری ہوتا ہے کہ کیرکٹر حقیقت کے اور ڈرامہ قواعد فن کے مطابق ہو۔ اس کامیڈی کا رواج سکندر اعظم اور مینینڈر کی وفات کے مابین ہُوا۔ اِس وقت یونانی سٹیج اچھا خاصہ مکتب اخلاق بن گیا۔ اور شعراء نے اِس میں جو فکر، نزاکت اور شان پیدا کی اِس سے اس فن کو چار چاند لگ گئے۔

ٹریجڈی اور کومیڈی کے مناصب اس طرح یونان ادبیات کی اعلیٰ ترین صنف سے مالامال ہوگیا۔ عہد قدیم کے یونانی ہمیشہ ٹریجڈی اور کومیڈی کو دو جداگانہ اصناف تصوّر کرتے رہے۔ ہاں رقص و سرود شعرخوانی اور تقریریں دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی تھیں۔ اور یہ اعلیٰ درجہ کے شاعروں کے تخیل کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ مگر یہ جائز نہ تھا کہ کوئی ٹریجڈی نویس کومیڈی لکھے۔ تعلیم یافتہ اشخاص ایکٹ کرتے تھے۔

ایکٹر اور ایکٹری کا پیشہ ذلیل خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ مشہور مقرر ڈیماستھنیز کے بارے میں روایت ہے کہ ڈراما اس کی تعلیم کا جزو اعظم تھا۔ ایکٹر سی ٹائرس (Satyrus) اس کا دوست اور معلّم تھا اور اسے بتایا کرتا تھا کہ کس طرح حرکات وسکنات کی مدد سے وہ اپنی تقریروں کو موثر بنا سکتا ہے، مشہور ایکٹر نیوٹولی لس (Neotolylus) اور ارسٹوڈیمس (Aristodymus) ممالک غیر میں سفارتوں پر مامور ہوتے تھے۔ جہاں ان کی بہت آؤبھگت ہوتی تھی۔

یونانی تھیٹر یونانی تھیٹر ایک نیم دائرے کے شکل کی بے سقف عمارت ہوتی تھی جس کے نچلے حصّہ میں سٹیج ہوتا تھا اِس میں گول دنگل (Ampheatheatre) کی طرح نشستوں کی قطاریں تدریجاً بلند ہوتی چلی جاتی تھیں۔ اس کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ تین[3] ہزار تماشائی اس میں آسانی سے سما سکتے تھے۔ ایکٹر مصنوعی چہرے

لگاتے تھے۔ اور قد کو بلند کرنے کے لئے بسکن پہنتے تھے (Buskin) جو ایک قسم کی اونچی ایڑی کے بوٹ ہوتے تھے ان مصنوعی چہروں کا منہ ترُم نما ہوتا تھا۔ تاکہ آواز دور تک پہونچ جائے اِسی سے کلمہ ڈرامٹک پرسنی وضع ہُوا ہے یہ لاطینی لفظوں پَر (Per) بمعنی ذریعہ اور سینو (Seno) بمعنی آواز نکالنا سے بنا ہی جس کے لغوی معنی ڈرامے کے مصنوعی چہرے کے ہیں۔ اسی طرح انگریزی لفظ (Person) شخص، ہی جس کے لغوی معنی بولنے کا "ترُم" ہیں۔ تماشے روز روشن میں ہوتے تھے اور دن بھر رہتے تھے۔ تین ڈرامے اور ایک نقل ایک دفعہ دکھائے جاتے تھے۔

تھیٹر کے اخراجات چوں کہ ڈرامے مذہبی اور قومی لوازمات میں شمار ہوتے تھے اس لئے اس کے تمام اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا ہوتے تھے۔ مقتدا یانِ مذہب فرماں روایاں ملک، تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ، غرض کہ ہر شخص ایکٹروں کی قدر افزائی میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور ان پر خطابات انعامات مناصب جلیلہ اور جاگیرات کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ اور شعرا پارٹ لینے کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے۔

اتحادِ ثلاثہ یونانیوں نے اتحادِ ثلاثہ کے نام سے ڈراموں کے لئے جو اصول وضع کیا وہ زیادہ تر اس لحاظ سے اہم ہی کہ اس سے یورپ کے ڈرامہ نگاروں میں ایک لامنتہی بحث کا دروازہ کھل گیا ہی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہی اور جس کا تذکرہ آیندہ جابجا آئے گا۔ یہ اصول تین حسب ذیل شقوں پر مشتمل ہی۔

اتحادِ زماں اس کا منشاء ہی کہ جو کچھ ڈراما میں دکھایا جائے وہ ایسے واقعات تک محدود ہو جو ۲۴ گھنٹے میں واقع ہوئے ہوں۔

اتحادِ مکان یہ چاہتا ہی کہ تمام واقعات ایک ہی مقام سے تعلق رکھتے ہوں۔

اتحادِ عمل اس کا تقاضا ہی کہ کسی ایک ڈرامے میں صرف ایک ہی ایکشن، واقعہ یا پلاٹ ہونا چاہیئے۔ آخر الذکر دُنیا بھر کا مسلّمہ کلیہ ہی۔ مگر بحث پہلے دو شقوں کے متعلق ہی۔

قیصر کا راکلا یونان میں ڈراما پر طرح طرح کی گُل کاریاں ہو رہی تھیں کہ ۲۱۵ء میں جہاں سوز کاراکلا

قیصرِ روم آندھی اور طوفان کی طرح آیا اور ایک دن میں سکندریہ میں قتلِ عام کر کے اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور تمام یونانی تہذیب کا خاتمہ کر دیا۔ تمام تھیٹر حکماً بند کر دیئے گئے۔ اور ڈرامے کا ایکٹ تعزیری جُرم قرار دیا گیا۔ فنِ ڈراما یونان میں معدوم ہو گیا۔ اور اِس کی رہی سہی رونق جاتی رہی

اِصلاحِ رسمِ خط

(۲)

(بسلسلہ رسالہ اردو حصّۂ پنجم جلد دوم)

(از جناب میر احمد علی صاحب ناظر تعلیمات ضلع ناندیڑ حیدرآباد دکن)

نقشۂ تعریب نمبر (۲) میں واؤ ماقبل مفتوح کا آخری سرا ہائے مختفی کی شکل میں مسودہ میں بنایا گیا تھا مگر طباعت میں اُس کی شکل بہت بھدّی بنا دی گئی اور نیچے کو ایک چونچ نکالی گئی ہے۔

اِسی طرح نقشہ تعریب نمبر (۳) میں یائی اعراب کی علامتیں جو (۷) اور (۸) کے الٹے سیدھے ہندسوں میں دکھائی گئی ہیں۔ طباعت میں بالکل بگاڑ دی گئی ہیں (۷) اور (۸) کے ہندسہ ضرورت سے زیادہ مقدار میں دکھائے گئے ہیں نیز (۷) اور اُلٹے آٹھ (۷) کے ہندسوں میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے (۷) سات اور اُلٹے (۷) آٹھ کے ہندسے باریک رہنے چاہئیں۔ (۷) کا ہندسہ یائے مجہول کی مختصر شکل ہے۔ اور اُلٹے آٹھ کا ہندسہ یا اسلئے جسے زیر کا نشان یائے حروف کے دائرہ کی مختصر شکل ہے۔ اب ترمیماً مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یائے ماقبل مفتوح کی علامت کے اظہار کے لئے بجائے آٹھ کے ہندسہ کے (ء) ہمزہ کی شکل خط منحنی قائم کی جائے کہ یہ یائے ماقبل مفتوح (ی) کی مختصر شکل ہے۔

یائے مخلوط

نقشۂ تعریب نمبر (۴) میں یائے مخلوط کے تلفظ کے اظہار کے لئے جو تشکیل قائم کی گئی ہے وہ خالی از دقّت نہیں معلوم ہوتی لہٰذا دو آسان اصول درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

(۱) اوّل۔ یائی اعراب کے آ یا وَ کے اتصال سے یائے مخلوط کا تلفظ از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے

(جھوڑا (۱) ۔ پچھونٹی (۲) دِہو ۔ سہو ۔ لہو (۳) کیا ۔ کیوں

(۲) دوم۔ جس طرح واؤ مجہول سے الف کے ساتھ واؤ مخطوط کا تلفظ قائم کیا گیا ہے۔ اسی طرح یائے مجہول سے

الف یا واؤ کے ساتھ یائے مخلوط کا تلفظ قائم کرلیا گیا ہی۔ جیسے۔ کیا۔ کیوں۔ پیو۔ پیو۔

نوٹ۔ واؤ معروف ومجہول کے اعراب میں ماقبل کا تلفظ بھی معروف ومجہول ہی ہو جاتا ہے جیسے (پیو۔ پیو) میں مگر کیوں میں ماقبل کا تلفظ غیر معروف مختفی لیؤ کا واؤ ملفوظ ہو معروف نہیں۔
لینے والا

ف۔ پہلا قاعدہ بہ نسبت دوسرے قاعدہ کے زیادہ آسان۔ جامع۔ وسیع الاثر مختصر اور اصولی ہی۔

(د)

حروف دال اور واؤ کی اشکال میں جو صوری التباس ہی اُس کے رفعداد کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہی کہ حرف دال کی کتابت وطباعت بجائے نستعلیق کے خطِ نسخ میں ہوا کرے یعنی اُس کا نچلا اور دوسرا سرا بھی پہلے اور اوپر کے سرے کی طرح پھیلا رہے۔

مرکب لفظ کا جوڑ توڑ

رسم خط اُردو کی اصلاحی تجاویز مندرجہ رسالہ اُردو جلد اوّل حصّہ اول و دوم سنہ۲۱ء میں مرکب لفظ کے درمیان وصل وفصل کی عدم یکساں کو رسم خط اُردو کا نقص عظیم قرار دیتے ہوئے اُس کے رفعداد میں جناب مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب نے چار قاعدے حسب ذیل تجویز فرمائے ہیں جن میں قاعدہ نمبر ایک وچار جو مختلف التعریف ہیں اور نتیجۃً ایک واقع ہوئے ہیں اس لئے کہ مرکب الفاظ کے اجزائے ترکیبی کا مستقل الفاظ ہونا یا مرکب الفاظ کا مستقل الفاظ سے ترکیب پانا ایک ہی بات ہی اس پر مولوی ہاشمی صاحب کو من حیث المجموع اتّفاق ہی محض قاعدہ نمبر ایک وچار کے صرف اُن مثالی الفاظ کے رسم خط وصل وفصل میں اختلاف ہی جو تخفیف یا ترخیم کی صورت میں واقع ہوئے ہیں۔

قاعدہ ۱و۴۔ ہر ایک مستقل لفظ جزو ترکیبی کا رسم خط مقطوع (الگ) ہو۔

قاعدہ ۲۔ لاحقہ یا سابقہ کا رسم خط جو مستقل معنی نہ رکھتا ہو متعلق علیہ (لفظ مستقل) کے ساتھ موصول ہو

قاعدہ ۳۔ حروف ربط کا رسم خط مقطوع ہو"

یعنی ہر ایک مستقل لفظ جزو ترکیبی اور حرف ربط کا رسم خط مقطوع اور جزو ترکیبی غیر مستقل لفظ کا موصول ہو۔

جناب ہاشمی صاحب | تمام مستقل الفاظ خواہ مفرداً استعمال کئے گئے ہوں، خواہ مرکب الفاظ کا جزو بن گئے ہوں۔ علٰحدہ علٰحدہ

بغیر ملائے لکھے اور چھاپے جائیں گے"۔

اختلافی جزو رسم خط (الفاظ تخفیف یا ترخیم شدہ)

مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب۔	کن پھٹا ۔ پن گھٹ	دونوں رسم خط میں ہر ایک جزو ترکیبی غیر سالم کا سابقہ
مولوی ہاشمی صاحب۔	کنپھٹا ۔ پنگھٹ	مستقل یعنی ترکیبی صورت میں واضح ہو رہا ہے۔

قواعد مجوزہ کی تنقید کے پیشتر بنا رتجویز (عدم یکسانی) کی واقسیت و نوعیت اور مواقعات و موجبات پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ عدم یکسانی زیر اصلاح کا رسم خط مختصر نویسی کے ساتھ کیا تعلق ہی اور کس درجہ اُس کی اصلاح ضروری اور ممکن ہی۔ چونکہ عدم یکسانی زیر اصلاح کا تعلق مرکب لفظ کے ساتھ وابستہ ہی اس لئے اولاً مرکب اور لفظ مرکب کے باہمی فرق کا اظہار مناسب معلوم ہوتا ہی۔

مرکب اور لفظ مرکب کا جو فرق ترکیب سے جب نوعیت کا اظہار مقصود ہو تو مرکب ہی اور اگر محض لفظیت کا اظہار بالمقابل پیش نظر ہو تو لفظ مرکب ہے یعنی کیسا مرکب ہی (نوعیت) اور کیسا لفظ ہی (مفرد یا مرکب) یہ فرق قرینۂ سوال مندرجہ صدر سے معلوم ہوجاتا ہی۔ مثلاً۔ سیل آب۔ ایک مرکب اضافی ہی اور سیلاب ایک لفظ مرکب ہی۔ یہاں یہ قرینہ سوال پیدا نہ ہوگا کہ سیل آب کیسا لفظ ہی یا سیلاب کیسا مرکب ہے۔ بلکہ بالعکس۔ نیز یہ کیسا لفظ ہے کا سوالی مقصود یہ ہوگا کہ یہ لفظ مفرد ہے یا مرکب۔ جیسے کھٹ رس ایک مرکب تعدادی ہی اور کھٹراگ ایک مرکب لفظ ہی۔ چھوٹی انگلی ایک مرکب توصیفی اور چھنگلی ایک مرکب لفظ ہی مگر بحالت تخفیف مرکب اور مرکب لفظی دونوں جمع ہو سکتے ہیں مرکباب توابعی اور الفاظ تمیز فعل بجز مرکبات (ہی حرف حصر) اور مرکبات نقل الصوت کا شمار مرکب الفاظ میں نہیں جیسے گُس پٹیہ۔ جوں توں۔ چوں چوں

قواعد مجوزہ مذکورہ بالا کے ذریعہ جو صحیح سالم میدان منقح سے ابھی واپس نہیں ہوئے ہیں۔ جوں توں کرکے صرف اُن الفاظ کی عدم یکسانی وصل فصل کا رفعداد ہوا ہی کہ جن کا محض ایک جزو ترکیبی (لاحقہ و سابقہ) انفراداً غیر مستقل واقع ہوا ہی۔ حالانکہ عدم یکسانی زیر اصلاح کا دخل و تعلق نسبتہً اُن مرکب الفاظ سے زیادہ ہی کہ جن کا جزو یا اجزائے ترکیبی انفراداً تو مستقل اور ترکیباً غیر مستقل واقع ہوئے ہیں۔ جن کا رسم خط بلالحاظ خصوصیات مختصر نویسی قواعد مذکورہ کی بنا پر محض رسم خط انگریزی کی اتباع میں ہمیشہ کے لئے مقطوع قرار دیا گیا ہی جس سے مفردات حکمی مرکبات کی صورت میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ باوجودیکہ مفردات

(اجزائے ترکیبی موصولہ) جو درحقیقت زبان کے اجزائے بسیط ہیں اور زبان کے اصلی سرمایہ کا وقار و اعتبار قائم رکھتے ہیں۔ اُن کا انحطاط زبان کا انحطاط ہے اور یہ انحطاط "کاتا سوت کپاس" کے مصداق ہے۔ قواعد مذکور کا رسم خط انگریزی کی اتباع اور اُسی کی مناسبت سے مترتب ہوئے ہیں جس کی تمہیدی مثالوں میں (دیکھتے دیکھتے اور دوپہر) کا رسم خط موصول یعنی بلافصل تصور کر لیا گیا ہے۔ رسم خط انگریزی منفصل حرفوں میں واقع ہوا ہے۔ بخلاف اس کے اُردو کا رسم خط متصل و مختصر صورت میں ہے اس لئے قواعد مذکورہ اردو فارسی وغیرہ کے رسم خط پر چسپاں نہیں ہو سکتے۔ اُردو کے رسم خط کا تعلق مختصر نویسی سے ہے جو بہ اعتبار وصل و فصل ایک ہی تلفظ کی مختلف صورتوں پر منطبق ہوا کرتا ہے جس سے کبھی تو تلفظ کا اظہار اور کبھی معنی کا امتیاز مقصود ہوتا ہے اور کبھی تو اُس سے اختصار اور حُسن خط مطلوب ہوتا ہے جس پر جزو لفظ ایک جز ترکیبی اور جز ترکیبی ایک جز لفظ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے مختصر نویسی کا رسم خط ترکیبی بہ اعتبار وصل و فصل عدم یکسانی کا مقتضی ہے یعنی مختصر نویسی یا عدم یکسانی ایک ہی چیز ہے۔

رسم خط

"تحلیل و ترکیب"

نمبر (۱)

(رعایت تلفظ)

(ٹال مٹول۔ ٹالم ٹول)	وہ ہی	یہ ہی		گُل ستاں
ٹالمٹول	وہی	یہی		گلستاں

ذوقؔ اس بحر فنا میں کشتی عمر رواں ؛ جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہو گیا

یہ ہی سورج زمیں تھے ماں باوا ؛ مجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا

(۲)

(رعایت تلفظ و معنیٰ)

(چھ دام) چھدام) (چھ ٹانک۔ چھٹانک)۔ (سی آم۔ سیام)

(بال امرت ۔ بالامرت)

دوا (بچہ نہ مرنے کی) دوا (بچے مرنے کی)

(۳)

رعایت معنی یا سیاق عبارت کا عاملانہ اثر

یعنی یکساں تلفظ میں رسم خط تابع ہوگا معنی کے

(خوش آمد ۔ خوشامد) (عظیم آباد ۔ عظیما باد) (کل آئی ۔ کلائی)
(بے معنی)

(سکھے لو ۔ کھیلو) ۔ (بے روزہ ۔ بروزہ) ۔ (سی لا ۔ سیلا) (سقفِ بے ستون ۔ کوہ بیستون)
(یہ امیر کہلاتا ہے ۔ امیر یہ کہلاتا ہے) (وہ ہٹ کر مٹھا ۔ وہ ہٹکر مٹھا (گنبد)) (چھین لا ۔ چھینلا) (مبارک باد ۔ مبارکباد)
خوش ہی) یہ کُتّے کٹکھنے ہیں ۔ تختی پر کٹ کھنے بڑے ہیں) (لن ترانی ایک آیۃ قرآنی ہی ۔ آپ کی لنترانی (جو) ختم بھی ہوگئی)
(دختر درزن کا سینا دیکھکر ۔ جی یہ چاہتا ہی کہ مل دیجیئے (مل مل)) ۔ تن درست ہی اُس کا جو تندرست ہی ۔
(کلائی ہاتھ میں لیکر مرے دل کو کل آئی ہی)

مالا پھرت جگ گیا گیا نہ من کا پھیر　　کر کا من کا چھوڑ کے من کا منکا پھیر
جو کوئی کسی کو یار کلپ ئیگا　　یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پائیگا
پادشاہے بہ کاشمیری گفت　　کاش میری کہ من خلاص شوم

(۴)

(ادبی و خطابی حالت)

ادبی	خطابی
انشاءاللہ وہ آج آئیگا	انشاءاللہ خاں آج آئیگا
چہل واری	چہلواری
دھواں سا	دھوانسا

ادبی	خطابی
کم رکھ	کمرکھ
دس تار	دستار
شک کرکھانا حرام ہے	شکرکھانا حرام نہیں
ناچ نادیکھنا عین سعادت ہے	ناچنا دیکھنا عین معصیت ہے

خطابی	ادبی
ہرایک راجپوت	راج پوت نہیں
رنجیت بڑا راجہ ہے	راجہ بڑا رن جیت ہے
صفدر	صف در وصف شکن ہے

(۵)

رسم خط

کہ + ا

(رعایت وزن شعری)

کہ اخلاق - کاخلاق = از صحبت دوستاں برنجم - کاخلاق بدم حسن نمایند = کہ اِحتمال - کاحتمال (کحتمال)= ترک احسانِ خواجہ اولیٰ - (کخلاق) کاحتمال جفائے بواباں -

(۶)

رسم خط مرکبات

ہی

(یوں ہی - یونہی) - (جوں ہی - جونہی)

(۷)

رسم خط

ہا و جات

(جام ہا - جامہا) (جامہ ہا - جامہا) (تختہ جات - تختجات)

(۸)

الف بشکل یا

(اوے تر - اولتر) (مثنی جات - مثنجات) (مولانا - مولینا) (علاحدہ - علی حدہ - علیحدہ)

(۹)

مکرر - مشدد - مخفف

(شب بو - شبّو) (ان نیالی - انیالی) (شبِ برات - شبراتی و شبراتن)

(۱۰)

(ہمزۂ موصول و مقطوع)

(مفردات)

(مسئلہ - مسالہ) (ہیئت - ہیأت)

(۱۱)

اختصار اور حسن خط

(۱) - (اس کے لئے - اسکیلئے) (باگ ڈور - باگڈور) (کم بخت - کمبخت) (کم زور - کمزور)

(۲) بیکسی - بے بسی (بیبسی) - پیشرو - پیش خیمہ (پیشخیمہ) - جانفروش - جان نثار - کم گو (کمگو) - کم سخن (کمسخن) -

(۱۲)

مفردات کا رسم خط مرکبات کی شکل میں

ف - مفردات کا جوڑ کبھی جدا نہیں ہوتا ہے تا وقتیکہ شروع یا درمیان میں حرف سالم (ا - ڑ - ر - ز - د - ڈ - ذ - و / اردو)

نہ داخل ہو جائے مگر محض اظہار تلفظ کی خاطر جیسے سٹ پٹانا ۔ بی بی ۔ چٹ پٹا ۔ جھٹ پٹا ۔ کپن چنگا ۔ تمثیل رسم خط مندرجہ بالا سے جس عدم یکسانی کا اظہار ہو رہا ہے اس کو نقص عظیم تصوّر کرتے ہوئے اُس کا ازالہ مجوزہ قاعدوں کی رو سے کس درجہ ہو رہا ہے ۔ غور طلب ہے ۔

قاعدہ ۱۰ا کا موضوع بالاتفاق اجزائے ترکیبی کا انفراداً مستقل لفظ ہونا قرار پایا ہے ۔ حالانکہ ایک مرکب لفظ کے معنی بہ ہیئت اجتماعی و ترکیبی دیکھے جاتے ہیں نہ کہ بہ ہیئت جزئی و انفرادی اس لئے مرکب الفاظ کے اجزائے ترکیبی کے مستقل یا غیر مستقل ہونے کا جو اصول تجویز پایا ہے وہ رسم خط زیر بحث کا معیار نہیں ہو سکتا ہے ۔

(۱) مستقل لفظ کے قرار داد میں ترکیبی حالت نظر انداز کر دی گئی ہے جو در اصل اجزائے ترکیبی کے مستقل ہونے یا نہ ہونے کا معیار ہے جس میں مستقل الفاظ اپنے اصلی معنوں میں واقع نہ ہونے پر ترکیباً غیر مستقل ہو جاتے ہیں جیسے (قلمرو صوابدید ۔ سرخرو ۔ خمیازہ ۔ خوشدامن ۔ ششدر ۔ صفدر ۔ لنترانی ۔ شاخسانہ ۔ آجکل (ان دنوں) جمعرات ۔ کشمکش گوشوارہ (خلاصہ) حلالخور (بھنگی) ہیدوست ۔ زمزم ۔ امرتسر ۔ نامرد ۔ قلمبند ۔ گفتگو)

(۲) اسی طرح وہ الفاظ بہ ہیئت اجتماعی ' ترکیبی معنوں میں مربوط ہو کر مستقل بن جاتے ہیں ۔ جو انفراداً مستقل نہیں جیسے ۔ ہمجولی = ہم (جوڑی ۔ جولی ۔ زولی) ہموار ۔ دشوار

(۳) اجزائے ترکیبی کے سالم یا غیر سالم ہونے ۔ تخفیف و ترخیم وغیرہ کے معنوی یا لفظی ہونے اور اُن تخفیف شدہ الفاظ کی اصلیت کا امتیاز اسی ترکیبی حالت کی خصوصیت پر موقوف ہے ۔ سالم غیر سالم (کن کوت ۔ کنوٹپ) کھٹ رس کٹھمل ۔ تخفیف و ترخیم لفظی یا معنوی (تختی کے کٹ کھنے ۔ کٹکھنے کُتّے و کتّی تکلیہ ۔ گل مالا)

اصلیت ۔ پنکٹی ۔ (پان) پنگھٹ (پانی) پنسیری (پانچ) چھوٹ پن (چھوٹا) پن چھٹ (پانی چھوٹنا)

(۴) اگر اجزائے ترکیبی کے مستقل یا غیر مستقل ہونے کا معیار جزوی یا انفرادی معنی رہیں گے تو خواہ مخواہ مرکب تمام الفاظ (مفرد) کی مربوط و غیر مربوط تحلیل ہونے لگے گی ۔ جیسے دستار (دس تار) کمرکھ (کم رکھ) چھدام (چھ دام) منکا ۔ (من کا) متوالا (مت والا) متلانا (مت لانا) ڈبڈبانا (ڈب ڈبانا) ململا (مل ملا) پھٹپھٹا (پھٹ پھٹا) کلپانا (کل پانا) گھیگوار (گھی گوار)

مندرجہ بالا مثالوں میں ایک ہی قسم کے الفاظ کی تحلیل و ترکیب کے حسب ذیل قاعدے مقرر ہو سکتے ہیں ۔

ف ۱۔ مرکب لفظ کے ہر ایک جزو یا اجزائے ترکیبی اپنے اصلی معنوں میں واقع ہوں تو رسم خط حسب موقع موصول یا مقطوع ہوگا۔ اور ایسی ترکیب ترکیب معنوی متصور ہوگی جیسے (باگ ڈور ۔ باگڈور)

(۲) مرکب لفظ کے جزو یا اجزار ترکیبی۔ اپنے اصلی معنوں میں واقع نہوں تو رسم خط موصول ہوگا۔ ایسی ترکیب ترکیب لفظی متصور ہوگی۔ جیسے حلالخور۔ قلمرو۔ کھڑاک۔ زمزم۔ ہیدوست۔ خوشدامن وغیرہ۔

(۳) اگر ترکیب میں اجزار ترکیبی کے اصلی معنوں کا اظہار تشبیۃً یا نسبۃً ہو تو ایسی ترکیب بھی ترکیب معنوی متصور ہوگی۔ مگر اس کا رسم خط ہمیشہ مقطوع ہوگا جیسے ناگ پھنی (ناگ کے پھن کا سا درخت) اونٹ کٹارا (کانٹے دار درخت جو اونٹ کا من بھاتا ہی)

(۴) ایسے مرکب الفاظ کا رسم خط کہ جن کے اجزار ترکیبی متحد الاصل ہوں یا مختلف الاصل مگر متحد المعانی ہوں تو موصول ہوگا جیسے۔ پلصراط۔ ناپناؤ۔ جلپان۔ محلسرا۔ سنہری۔

(۵) وہ ترکیبی الفاظ کہ جن کا مفہوم محض ترکیبی صورت میں واضح ہوتا ہو یا وہ مرکب الفاظ کہ جن کے مفہوم اور ہیئت اجتماعی۔ بطور مفرد کے پائے جاتے ہوں اُن کا شمار مفرد حکمی میں ہوگا اور اُن کا رسم خط موصول جیسے فیلسوف شیشدرہ۔ آبخورہ۔ برشکال۔ دیسکھہ۔ زہریر۔ ہردلعزیز۔ چشمدید۔

(۶) الفاظ ذیل کے فارسی مرکبات کا رسم خط عموماً مفرد حکمی و ترکیبی لفظی کی طرح موصول ہوگا۔

{گل (ف۔ ۵) بیش۔ خوش۔ دل۔ آب۔ دست۔ سبک۔ یک}

(۷) اسمار (محلہ۔ قصبہ۔ شہر) کے مرکبات میں مستقل الفاظ کا رسم خط مقطوع ہوگا مگر اُس آخری لفظ کا رسم خط موصول ہوگا جو مرکبات سے مخصوص ہی۔ جیسے رامپور۔ مونگیر۔ سومناتھ۔ نلدرگ۔ کلیکٹ۔ گلبرگہ۔

(۸) الفاظ نقل الصوت کا رسم خط مقطوع ہو۔ جیسے قُل قُل۔ چوں چوں۔ سن سن وغیرہ۔ جب اس قسم کے الفاظ اسم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو اُن کا رسم خط موصول ہوتا ہی جیسے قہقہہ اور قلقل۔

تخفیف یا ترخیم

مولوی ہاشمی صاحب (کنپھٹا۔ پنگھٹ)

مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب (کن پھٹا۔ پن گھٹ)

اب قاعدہ نمبر (۴) کے اُس اختلافی جز سے بحث کیجائیگی کہ جس کا تعلق مرکب الفاظ کے اجزار ترکیبی کی تخفیف یا ترخیم سے ہی - بلحاظ معنیٔ انفرادی - قرینہ استدلال میں دونوں صاحبوں کا اتفاق ہی مگر طریقہ استعمال میں اختلاف - مولوی ہاشمی صاحب کا محض طریقہ استعمال درست اور قابل اتفاق معلوم ہوتا ہی، اِس لحاظ سے کہ ایک درخت کا دوسرے درخت میں پیوند بغیر قلم کئے نہیں لگتا ہی اسی طرح پتھر اور لکڑی کا جوڑ بھی اس وقت تک ٹھیک نہیں بیٹھتا جب تک کہ جوڑ کے اجزار میں کانٹ چھانٹ نہ ہووے ایسے اکثر الفاظ کا جوڑ کٹ چھٹ کر اور آپس کے اختلاط اور ارتباط کی رعایت سی متاثر ہو کر کچھ ایسا پیوست اور ایک قالب ہو جاتا ہی کہ اُس کے اجزار کی اصلیت کا اظہار بہت مشکل ہو جاتا ہے جیسے تگنا، نکٹا - گستا نگر - چھنگا چھنگلی پُھلیل وغیرہ -

سنگت سی پھل ہوت ہی وہی تِل وہی تیل ‏ ‏ ‏ ‏ جات پات سب چھوڑ کر پایا نام پھلیل

مگر یہ اصول ہمیشہ کے لئے بطور کُلیہ قائم نہیں ہو سکتا - اس لئے کہ یہی تخفیف جب لفظ کی معنوی خصوصیت میں واقع ہوگی تو وہ تخفیف ملتوی متصور ہوگی - پس تخفیف لفظی و تخفیف معنوی دونوں صورتوں کا رسم خط کسی طرح ایک ہو نہیں سکتا جس طرح ترکیب معنوی کا رسم خط مقطوع قرار دیا گیا ہی اسی طرح تخفیف معنوی کا رسم خط بھی مقطوع ہونا چاہئے اور تخفیف لفظی کا موصول تخفیف لفظی - کنپھٹا - نگھٹ - اچور - جمعرات - بچپن (اعراب اور ہائے مختفی کی تخفیف) مگر جب تلفظ یا معنی میں التباس کا اندیشہ ہو یا کتابت میں دشواری تو رسم خط مقطوع ہونا چاہئے جیسے رت بھیہ - رت بجا (رتنجا)

تخفیف معنوی جز اول - گل مالا - (تخفیف ‏ ‏ ‏ ‏) بھتیج (بہو - داماد)
(گلا)
(تخفیف ‏ ‏ ‏ ‏)

کال کوٹھری - کل (جبّا - جبّی - منہا - منہی - سرا سری) اکل (کھرا - کھری) چھٹ پونجیا - ادھ (موا - موئی) گل پٹرا -

تخفیف معنوی جز دوم - مونہ پھٹ - بگ ٹٹ - لکہ لٹ - کھل اُپاڑ (اُپاڑنے والا)

فارسی مرکبات تخفیف شدہ

(فارسی اسنادات کی تخفیف و ترخیم تبدیل - تقلیب)

تخفیف واؤ عطف - رستخیز - تیدست - گلقند (رست و خیز - تے و دست - گل و قند)

تخفیف علامت اضافت ۔ آبدست ۔ گلچمن ۔ گلحکمت ۔ نیشکر (آب دست ۔ گل چمن ۔ گل حکمت ۔ نے شکر)

تقلیب بہ فک اضافت ۔ دستخط ۔ تبخال ۔ شبخون ۔ خونبہا ۔ تندرستی ۔ خاکنائے (خطِ دست ۔ خال تب ۔ خون شب بہائے خوں ۔ درستی تن ۔ نائے خاک)

حرف کی تخفیف = آبدیدہ (آب بدیدہ)

اعراب کی تبدیل = شبّو ۔ جمع وخرچ (اوّل کا واؤ معروف مجہول کے ساتھ ۔ دوم کا واؤ مجہول معروف کے ساتھ)
(شب بو) (جمع وخرچ)

قاعدہ ۲ ایسے لاحقہ و سابقہ کا رسم خط موصول قرار دیا گیا ہی جو معناً و انفراداً غیر مستقل ہے اور مثال میں صرف اس لاحقہ کا انحصار ہوا ہی جو بصورت علامت فعل (گا) انفراداً غیر مستقل واقع ہوا ہی ، اور نوعیت لفظی اس کی علامت سے مخصوص ہو جاتی ہی مگر قاعدہ مذکور میں نوعیت لفظی کا تعین ہوا ہی نہ کثرت امثال کے ذریعہ مختلف صورتوں کی صراحت کی گئی اور سابقہ کی تو کوئی مثال ہی نہیں جس سے یہ قاعدہ بعنوان لاحقہ محض علامات فعل کے لئے مختص ہوگیا ہی ۔ حالانکہ ایک مستقل لفظ جبکہ حالت ترکیبی میں اصلی معنی نہیں دیتا ہی تو بصورت لاحقہ سابقہ اُس کا رسم خط بھی موصول ہونا چاہئے جیسے رفعداد ۔ مبارکباد ۔ یہ قاعدہ ترمیماً حسب ذیل واقع ہوگا ۔

"ایسے لاحقہ یا سابقہ کا رسم خط موصول ہوگا جو مستقل معنی رکھتا ہے نہ دیتا ہی" سابقہ ولاحقہ کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں (ایک تشبیہ کہ کوئی لفظ انفراداً غیر مستقل اور ترکیباً مستقل ہو

(۲) دوسری یہ کہ انفراداً مستقل و ترکیباً غیر مستقل ہو ۔

(۳) تیسری یہ کہ انفراداً و ترکیباً ہر دو حالت میں غیر مستقل ہو یہ تیسری حالت علامتی مرکبات سے نامزد ہوسکتی ہی

تمثیل

(۱) امروز ۔ دیشب ۔ دیروز ۔ ہیجولی ۔ دُشنام وغیرہ (مرکبات سابقہ جات)

(۲) (الف) مبارکباد ۔ (مبارکی) بہبود (بہتری) رقمطراز (رقمی یا قلمی) چالباز (چالیا) خوشنودی (خوشی) رفعداد ۔ گوشوارہ وغیرہ ۔

ب ۔ دوستدار (دوست) تابعدار (تابع) چغلخور (چغل) فارغبال (فارغ = بالبال فارغ) دکان کیونکر ۔ خاصکر (یہاں جزو دوم یا لاحقہ اپنے اصلی معنی نہیں دیتا)

(ج) (۱) رستخیز ۔ گلبانگ ۔ سیمرغ (سابقہ جات اصلی معنوں میں نہیں)

(۲) خوشبو (سگند) خوشنما (سہانا) دشنام کے سابقہ جات علامت صفت کا کام دیرہی ہیں۔

(۳) جمعدار ۔ عنقریب ۔ انجان ۔ کاشتکار ۔ منجملہ ۔ جانور ۔ خاکسار ۔ خوفناک ۔ غمگین ۔ گلزار ۔ دھرمشالہ باگلپن (پاجی پن) بیشتر ۔ پاندان وغیرہ

مرکبات علاماتی اور ے و ہ کے فارسی مرکبات مثلاً (بیشک ۔ بیچارہ) و (ہمشیرہ ۔ ہمدرد وغیرہ مفرد حکمی اور مرکبات (ہی) بجز حالات خاص

بہ استثنار علامات (اہل ۔ والا ۔ صاحب ۔ پن ۔ بے (مع واؤ عطف) نیز علامات جمع فارسی ۔ ہا وجات (رکھوالا) (بے شک وشبہ) جامہ ہا ۔ نامہ جات ماقبل ہائے مختفی ۔

قاعدہ ۳ ۔ رسم خط ترکیبی کے مضمون زیر بحث سے خارج ہی اس لئے کہ اس کا تعلق مرکب لفظ سے نہیں ۔ یعنی حرف بلحاظ ربط کلام کے طرفین کا عدیل ہی ۔ وہ دو متصل لفظوں کے درمیان واقع ہوتا ہی اس کا رجحان اتصالی ماقبل کے ساتھ ہوگا نہ مابعد اس صورت میں بیشک ایک مستقل لفظ کا کام دے سکتا ہی اور رسم خط رواجی بھی اس کا یہی ہی کہ وہ دو متصل لفظوں کے درمیان الگ لکھا جاتا ہے ۔ مگر جب ضمیر کے ساتھ ہو تو وہ ضمیر کا ایک لاحقہ تصور کیا جائیگا اور ضمیر بھی اس کا متعلق علیہ ہوگا ۔ کیونکہ ضمیر کا لفظ شکلی تغیر کے اعتبار سے حرف ربط سے متاثر ہوتا ہی یا خود حرف ربط متعلق علیہ سمجھا جائیگا ۔ اور متغیرہ ضمیری الفاظ اس کے سابقہ ۔ کیونکہ ضمایر کی تبدیل شدہ صورت بغیر اظہار حالت فاعلی ۔ مفعولی واضافی (نے ۔ کو پر ۔ کا) کے کوئی مستقل معنی نہیں رکھتی ہی ۔ جس طرح تخفیف یا ترخیم لفظی کی حالت میں ایک مستقل لفظ غیر مستقل متصور ہوتا ہی تو تبدیل کی حالت میں بھی غیر مستقل سمجھا جانا چاہئے اور حسب مثال کن پھٹا و ننگھٹ کے تخفیف یا ترخیم شدہ لفظ ملاکر لکھا جاتا ہے ۔ اسی طرح تبدیل شدہ لفظ کو بھی ملاکر لکھنا پڑیگا اور بحالت تبدیل ملاکر لکھے جانے کی تمثیل میں بی بی اور لے لوٹ کے تبدیل شدہ الفاظ بیوی اور لیلوٹ موجود ہیں ۔ علاوہ اس کے اس خصوص میں متغیرہ الفاظ ضمیری کی مثالیں موجود ہیں ۔ (مجھکو ۔ تجھکو) بنأ علیہ ۔ حروف ربط کی بحث قاعدہ (۲) (سابقہ ولاحقہ کے تحت ہونے چاہیے ۔ باستثنار (میں اور سے) حروف ربط کا رسم خط ضمایر متغیرہ کے الفاظ کے ساتھ وصل وفصل دونوں طرح سے جاری رہتا رسم خط اردو کی نسبت عدم یکسانی کا نقص متصور نہیں ہوسکتا ہی ۔ تاہم اُس کی کتابت موصول وطباعت مقطوع ہو تو نامناسب نہ ہوگا ۔ تیسرے

قاعدے کو مخصوص تو کیا گیا ہی۔ حروف ربط کے رسم خط سے گر مثال میں بقیہ اقسام حروف عطف وغیرہ سے ہی بحث کی گئی ہی اور اُن حروف کے ریزے ریزے کر دئے گئے ہیں۔ پھر بھی یہ قاعدہ حروف تخصیص اور حروف عطف کے رسم خط کی اصلاح پر حاوی نہیں ہوسکتا ہے۔ حالانکہ حرف تخصیص (ہی) کا رسم خط بہ اعتبار وصل وفصل کے مختلف فیہ ہی۔ غرض اردو زبان میں بیسیوں الفاظ نے (ہی) کے ترکیب سے مستقل لفظ کی صورت اختیار کر لی ہی۔ اسی طرح اکثر حروف عطف مرکب الفاظ کی صورت میں واقع ہوئے ہیں اور جن کے اجزاء ترکیبی اسماء وافعال پر مشتمل ہیں اور رسم خط ترکیبی اُن کا بھی مختلف ہی مثلاً

نہ کہ ۔ نکہ ۔ چناں چہ ۔ چنانچہ ۔ کیوں کہ ۔ کیونکہ ۔ کیوں کر ۔ کیونکر ۔ اسلئے ۔ اس لئے ۔ لہٰذا ۔ مع ہٰذا ۔ معہٰذا

جب کہ ۔ جبکہ ۔ بل کہ ۔ بلکہ ۔ حالاں کہ ۔ حالانکہ ۔ بشرطے کہ ۔ بشرطیکہ وغیرہ۔

اسی قاعدہ کے تحت حروف بہ اور نہ کا رسم خط مقطوع قرار دیا گیا ہی اور اردو کی مختصر نویسی کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ یہ حروف کہیں تو زائد اور کہیں جزو لفظ کی صورت میں واقع ہوئے ہیں جیسے ۔ نپوتی ۔ نہوت ۔ ندیدہ ۔ ہونہو ۔ بعذر بجز ۔ بدولت ۔ بموجب ۔ بغیر ۔ بوضاحت ۔ بتدریج ۔ بتفاریق ۔ بتنگ ۔ بقول ۔ بہر (حال ۔ طور وغیرہ) بدستور بخیر

درمیان میں

۔ روبرو ۔ جابجا ۔ ہوبہو ۔ خانہ بدوش ۔ درجہ بدرجہ ۔

حرف نہ ۔ افعال کرنا ۔ بولنا ۔ دینا ۔ ہونا کے ساتھ موصول ہوتے پر بھی ترکیبی تلفظ میں التباس پیدا ہوتا ہی نہ جوڑ میں کوئی بدنمائی پائی جاتی ہے۔ بلکہ بعض مواقع پر ترکیبی واتصالی صورت ہی رفع التباس کا موجب ہوتی ہی جیسے روانہوا (روانہ ہوا) زنانکر (زنا نہ کر)

(سے)

حروف جار و تشبیہ

حروف جار سے اور حرف تشبیہ سے کا رسم خط قابل امتیاز ہونا چاہئے اس لئے مناسب ہوگا کہ حرف جار سے کا رسم خط موصول اور حرف تشبیہ سے کا رسم خط مقطوع ہو۔ مرکبات حروف عطف کا رسم خط اس اصول پر کہ اُن کے جزئی معنی مقصود نہیں یا ان جزئی معنی ظاہر نہیں ہوتے ہیں موصول ہونا چاہئے

گوشوارہ

رسم خط مرکب الفاظ

مرکبات

علاماتی | الفاظی

مرکب علاماتی کا رسم خط موصول ہو بشرطیکہ رعایت تلفظ اور حُسن خط قائم رہے ورنہ مقطوع (مزہ دلا - بے بسی - کشتی بان - ہم مشرب - ان بن)

الفاظی - { سالم - غیر سالم (تخفیف یا ترخیم شدہ) }

سالم - (لفظی - معنوی) نمبر ا کا رسم خط موصول - مرکبات مفرد حکمی - مرکبات حروف عطف و حرف حصر (ہی) کا رسم خط موصول نمبر ۲ کا موصول یا مقطوع -

غیر سالم - (لفظی - معنوی) = نمبر ا کا رسم خط موصول - نمبر ۲ کا مقطوع -

+ = مرکبات علاماتی - مرکبات سالم ترکیب لفظی - مرکبات مفرد حکمی - مرکبات حروف عطف حصر - مرکبات غیر سالم تخفیف لفظی -

- = مرکبات غیر سالم تخفیف معنوی -

± = مرکبات ترکیب معنوی -

عدم یکسانی رسم خط

عدم یکسانی کا حصر مرکب الفاظ کے وصل و فصل ہی پر نہیں ہو سکتا ہی بلکہ اس کا اطلاق املا کے ان الفاظ پر بھی ہوتا ہی جو متحد الصوۃ اور مختلف الصورت واقع ہوئے ہیں -

{ وہ الفاظ جن میں ب کا تلفظ مشدد اور ماقبل ن غنہ یا میم ہو }

ایسے ادغامی الفاظ کا املا کبھی میم اور کبھی نون کے ساتھ سنسکرت کی طرح اردو رسم خط میں بھی مختلف ہی - جیسے کھنبا - کھمبا - کنبل - کمبل - چنبر - چمبر - گنبد - گمبد - لنبا - لمبا -

عربی فارسی الفاظ کا رسم خط ت سے اور دیگر زبان کے الفاظ کا میم سے ہونا مناسب معلوم ہوتا ہی۔ عربی، فارسی الفاظ کا رسم خط ہمیشہ ت سے ہی ہوتا ہی۔ لیکن صرف ایک لفظ زبان فارسی کا ہی کہ اُس کا رسم خط شاید باعتبار اصول ت سے اور باعتبار اصل تم سے ہو کہ گُم آباد کا مخفف گمبد ہو گیا ہو جیسا کہ رُکن آباد کا مخفف رُکنا باد اور ہمایوں آباد کا ہمنا باد ہو گیا ہی۔

تائے منوّن

تنوینی الفاظ میں تائے منون کا رسم خط کبھی الف کے ساتھ اور کبھی تائے مختفی کے ساتھ ہوتا ہی جیسے وکالتہً واصالۃً۔ اصالتًا۔ مگر یہ اختلاف محض اُردو کے رسم خط میں دیکھا جاتا ہی عربی کے رسم خط میں نہیں پایا جاتا اور یہ رسم خط ہے بھی عربی ہی کا۔

پس اُردو میں بھی اس رسم خط کا تعیّن ازحد ضروری ہی جو حسب ذیل ہی۔

"تائے منون ماقبل متحرک کا رسم خط (ۃ) مختفی کے ساتھ ہو اور ماقبل غیر متحرک کا الف کے ساتھ ہو"۔ وکالۃً اصالۃً۔ وقتاً۔

(الفاظ متشابہ الصوۃ)

متحد الصوۃ و مختلف الصورت

(متحد المعنی)

(۱) تیار۔ طیار۔ شطرنج۔ تشترنج۔ فصیل و سفیل۔ التصاق۔ التساق۔ قفص۔ قفس۔ تاس۔ طاس
خراطین۔ خراتین۔ تنتنہ۔ طنطنہ۔ تباشیر۔ طباشیر۔ مسالہ۔ مصالحہ۔ خیر سلاّ۔ خیر صلاّح۔ صحیح۔ سہی
تارم۔ طارم۔ صحنک۔ سہنک۔ مثل۔ مسل۔ تشت۔ طشت۔ ذرا۔ زرا۔ رضائی۔ رزائی وغیرہ

متحدہ الصوۃ مختلف الصورت

(مختلف المعنی)

(۲) اسرار۔ اصرار۔ ثواب۔ صواب۔ زکوٰۃ۔ ذکوۃ۔ متبوع۔ مطبوع۔ نذر۔ نظر۔ کثرت۔ کسرت
صدا۔ سدا۔ حضر۔ حذر۔ سفر۔ صفر۔ اسراف۔ اصراف۔

(مختلف المعنی)

(الفاظ مشترک)

(۳) خط - خط } نظم - نظم } عرض - عرض } ذات - ذات }
لکیر مکتوب } کلام موزوں بندوبست } چوڑائی معروض } نفس - درد }

صدر - صدر } آثار آثار } اثنا اثنا } وغیرہ
بالا سینہ } نشانیاں دیوار کا دل } درمیان دو }

الفاظ نمبر ایک سے اس امر کی رہنمائی ہوتی ہی کہ الفاظ مختلف الصورت کا املا اصلاح طلب ہی اور یہ کہ اصلاح ناممکن نہیں ۔ بخلاف اس کے نمونہ الفاظ نمبر ۲ سے یہ پایا جاتا ہی کہ کلیۃً اختلافی صورت کا ارتفاع و اندفاع ممکن نہیں ۔ مختلف معنوں کے اظہار کے لئے مختلف صورتوں کا قیام ناگزیر ہی اس کا ارتفاع رموز معنی داری کے خلاف ہوگا ۔ یہ مختلف صورت باقی نہ رہیگی تو وسعت معنی کا وصف زائل ہوجائیگا صدا کا سدا سے اور سدا سے صدا کے معنی کسی طرح پیدا نہیں ہوسکتے ۔ مگر نمونہ الفاظ نمبر ۳ سے نمونہ الفاظ نمبر ا کی تائید اور نمبر ۲ کی تردید ہو رہی ہی ۔ جس میں سیاق عبارت کے تحت وسعت معنی کا وصف قایم رہتا ہی چنانچہ تقریر میں مختلف معنوں کی تمیز کے لئے سدا اور صدا کی مختلف اشکال کا معائنہ و مشاہدہ نہیں ہوتا جیسا کہ تحریر میں ہوتا ہی ۔ مگر پھر بھی اسی سیاق عبارت کے انداز سے جو تحریر میں ہی ہر ایک لفظ کے مختلف اور جداگانہ معنی از خود تمیز ہونے لگتے ہیں جو اثر معنی فہمی کا تقریر میں ہی وہی اثر تحریر میں بھی ہوتا ہی ۔ کیونکہ اس خصوص میں تحریر تابع ہوتی ہی تقریر کے ۔

ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں کہ جو نہ تو عربی الاصل ہیں نہ عربی النسل مگر پھر بھی عربی پوشش میں نمایاں ہیں ۔ جیسے طوطا ۔ رضائی ۔ صد ۔ شصت وغیرہ تو کیا یہ مولد (الفاظ) عربی پوشش کے ذریعہ عربی النسل بن سکتے ہیں ۔ حالانکہ اصول تو یہ مانا گیا ہی کہ "جیسا دیس ویسا بھیس" جس کی نظیر اطریفل و شطرنج کے الفاظ میں اُس وقت کی پائی جاتی ہی جبکہ یہاں سے وہ پردیس چلے گئے تھے مگر یہاں تو اپنے دیس میں رہ کر بھی پردیس کا بھیس ترک نہیں کیا جاتا ہے اور خودداری کو خیرباد کہدیا گیا ہی بخلاف اس کے خود عربی النسل الفاظ مندرجہ ذیل کس طرح اس مثل کے مصداق بن کر اپنی ہر دلعزیزی اور سیاست دانی کا ثبوت دے رہی ہیں جس میں

ایشیائی اتحاد کی صورت بھی عیاں ہے (قسائی - سہی - مسالہ - سفیل - نیر سلا) یہ بھی کوئی قرینہ ہے کہ تلفظ تو ایک آواز میں اور نمایش ہو اُس کی چار چار صورتوں میں - تلفظ کے میدان میں یہ کوتل گھوڑے کس کام آسکتے ہیں -

(ذ - ز - ض - ظ)

گو یہی صورتیں عرب میں بھی موجود ہیں اور وہیں کی یہ خود رو بھی ہیں مگر ہر ایک صورت کے لئے ایک خاص صوۃ اور ہر ایک صوۃ کے لئے ایک خاص صورت کا تعین بھی موجود ہے اور ہر صوۃ کا ایک جداگانہ مخرج بھی ہے جس کا استعمال وہاں نہایت بے تکلفی سے ہوتا ہے - غرض ان تمام متعدد صورتوں (ت ط - ث س ص - ذ ز ض ظ) کا املا وہاں اتنا ہی سہل و آسان ہے جتنا کہ یہاں (ب پ اور د ڈ) کا - کم سے کم اردوے معلی سے یہ بد نما صوری تفرقہ تو اُٹھ جانا چاہئے - جب ہندوستان میں متشابہ الصوۃ تلفظ تمام مختلف صورتوں کا ایک ہے تو اصول املا کی پابندی کے لئے صرف ایک صورت متحد الصوۃ کی کافی ہے - باقی صورتوں کی تخفیف مناسب معلوم ہوتی ہے چنانچہ بلحاظ سہولت و کثرت استعمال متحدہ الصوۃ حروف سے صرف ایک ایک حرف یا صورت کا حسب ذیل تعین ہو جائے

ز		س		ت
ذ - ز - ض - ظ	و	ث - س - ص	و	ت - ط

تاکہ آیندہ صحت املا میں منطقی تاویلات کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے کہ بلحاظ صفائی کے " سفید کا املا (ص) سے سا گوانی " صندوق " کا املا بلحاظ مادیت کے (س) سے ہونا چاہئے اور نام کے املا کی صحت میں آزادی کامل حاصل ہو جائے کیونکہ جس کے نام کا املا نذر نضر نظر (ذ ض ظ) ہوتا ہے اس کی صحت اُس وقت تک قابل اطمینان متصور نہیں ہوتی کہ صاحب نام کی جانب سے اُس کا تعین و تشخص ہو کر اجازت عطا نہ ہو - ایسے ناقابل اطمینان صحت کے املاے اردو کے بجائے انگلش یا ہندی رومن کیرکٹر پسند کر لیا جاتا ہے تاکہ عدم صحت املا

کی ندامت نہ اُٹھانی پڑے اسی کا نتیجہ یہ ہی کہ اپریل یا جولائی ۱۹ سنہ ع سے ممالک اودھ کی عدالتوں سے سرکاری اور عدالتی زبان کا رسم خط اردو سے ہندی میں منتقل ہو چکا مگر پھر بھی اصلاح کی جانب عبرت کی آنکھ نہیں کھلنے پاتی ۔

اصلاح رسم خط

(از جناب پروفیسر محمد نعیم الرحمن صاحب)

"اُردو" کے چھٹے نمبر میں جناب پروفیسر ہاروں خاں صاحب شروانی کا مضمون بعنوان "ہماری زبان اور ضروریات زمانہ" شائع ہُوا ہی۔ اس فاضلانہ مضمون کو پروفیسر صاحب نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہی:-

(ا) "اُصلاح رسم خط برائے ضروریات زبان موجودہ" اور

(ب) "غیر مانوس اعلام اور نئی اصطلاحات کی تحریر کے لئے نئی حرکات و سکنات کی ضرورت"، حصۂ اوّل میں پروفیسر صاحب نے ان مضامین پر تبصرہ کیا ہی جو اس سے قبل اسی موضوع پر "اُردو" میں شائع ہو چکے ہیں؛ اور حصۂ دوم میں غیر مانوس اعلام ... کے لئے تجاویز پیش کی ہیں۔ مؤخرالذکر حصّہ کے مطالعہ سے مجھے غائبانہ اُن کا مشکور رہونا پڑا، کیوں کہ میں نے دیکھا کہ پروفیسر موصوف نے نہایت محنت و کاوش سے فی الواقع نہایت نفیس تجاویز اس باب میں پیش کی ہیں، اور اس طرح میں نے اپنے مضمون میں اسی امر پر غور و خوض اور تجاویز کے لئے جو درخواست کی تھی اسے پروفیسر صاحب نے بہ احسن وجوہ غور فرمایا ہی۔ میں اُن کی تمام تجاویز کی تائید کرتا ہوں۔

اب رہا حصّۂ اوّل؛ اس کے متعلق میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ا- پروفیسر صاحب نے بالکل بجا فرمایا کہ "موجودہ ضروریات کا لحاظ کر کے جب ہم اُردو کی اشاعت کے خواہاں اور اسے ہندوستان کی عالمگیر زبان بنانے کے خواہشمند ہیں، تو اس کی ضرورت ہی کہ ہم اسے ایسے سانچے میں ڈھالیں کہ جو لوگ اس کا مطالعہ کرنا چاہیں اُنھیں اشکال و ابہام کا سامنا کرنا نہ پڑے"؛ اور یہ کہ جو مباحثہ اس وقت اس موضوع پر جاری ہی (اور جو اصلاحِ رسم خط کی کئی صورتوں میں سے صرف ایک اور نہایت ابتدائی صورت ہی) اِس کا واحد مقصد تلبیس اور دیگر نقائص کو دُور کرنا ہی"۔ حقیقی اصول یہی ہی، اور اسی کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

پروفیسر صاحب نے جناب مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب کی مجوّزہ واؤ مجہول (مثلاً جَو بہ شکل جوٜ) جناب مولوی سیّد احمد علی صاحب کی مجوزہ یائے مجہول (یعنی یؔ کے نیچے شوشہ) اور راقم الحروف کی تجویز کردہ یائے مجہول بین اللفظ (یعنی یؔ کے نیچے نشانِ ضرب ×) پر اعتراض کرتے ہوئے ان کو "اصلاح معکوس" کے نام سے موسوم کیا ہی۔ اِن تینوں صورتوں میں ان کے اعتراض کا ماحصل یہ ہی کہ اگر اِن مجوزہ صورتوں کو اختیار کیا جائے تو بھی تلبیس باقی رہ جاتی ہی۔ ان کے مقابلے میں پروفیسر صاحب کی تجویزیں یہ ہیں:-

۱۔ واو معروف۔ واو پر واوِ معکوس۔ جیسے دُور

۲۔ واو مجہول۔ واو بلا حرکت۔ جیسے دو۔ چور

۳۔ واو ماقبل مفتوح ۔حرف ماقبل پر زبر لگا دیا جائے۔ جیسے فَوج ۔حَوض۔ جَو

۴۔ یائے معروف۔ یا کے نقطوں کے نیچے ایک چھوٹی سی سیدھی لکیر۔ جیسے کھیر۔ بیر

(جب لفظ کا آخری حرف یائے معروف ہو تو ی)

۵۔ یائے مجہول۔ یا نقطہ دار بلا کسی خاص علامت کے۔ جیسے تیل۔ بیر

(جب لفظ کا آخری حرف یائے مجہول ہو تو ے)

۶۔ یائے ماقبل مفتوح۔ حرف ماقبل پر زبر لگا دیا جائے۔ جیسے پَیسا۔ بَیر

(جب لفظ کا آخری حرف یائے ماقبل مفتوح ہو تو یَ)

۷۔ یائے مخلوط۔ یَ کے نقطے اوپر تلے لکھے جائیں۔ جیسے کیا۔ پیاسا

پروفیسر صاحب نے راقم الحروف کے مجوّزہ نشان ضرب (برائے یائے مجہول) پر جو اعتراض کیا ہے وہی اعتراض اُسی کمال کے ساتھ پروفیسر صاحب کی مجوّزہ یائے معروف پر بھی ہو سکتا ہے: یعنی جس طرح ایک قاری نشان ضرب کو کسی غلط حرف یا نشان وغیرہ کی قطع و برید سمجھ سکتا ہے، ویسے ہی یہ بھی ممکن ہے کہ قاری کو اس "چھوٹی سی سیدھی لکیر" میں بھی (جو بسا ممکن ہے کہ شکستِ خط کی وجہ سے شوشہ ہائے سے مشابہ ہو جائے) تشابہ ہو سکتا ہے، تو چوں کہ تلبیس کا شائبہ اس صورت میں بھی ویسا ہی باقی رہتا ہے، اس لئے مجھے یہ تجویز بھی پسند نہیں۔ چوں کہ مجھے بلا وجہ اپنی تجویز پر زور دینا مقصود نہیں ہے، اور پروفیسر صاحب کی تجویز بعینہٖ وہی ہے جو پنجاب میں رائج ہے اور عمومی حیثیت حاصل کر چکی ہے، لہٰذا مجھے یائے مجہول کے باب میں پروفیسر صاحب سے کلّی اتفاق ہے۔

علیٰ ہذا القیاس پروفیسر شیرانی صاحب کی مجوّزہ واو معروف پر بھی بعینہٖ اسی طرح تلبیس کا اعتراض ہوتا ہے کیوں کہ ان کی مجوّزہ "واوِ معکوس" بالائی سطر کے لئے بمنزلہ شوشہائے کے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا میں اس کے لئے بھی پنجاب کی مروجہ صورت تجویز کرتا ہوں، یعنی یہ کہ واو معروف کے حرف ماقبل پر پیش دیا جائے۔ اس میں کچھ بھی تلبیس نہ ہو گی۔ اسی طرح پروفیسر صاحب کی مجوّزہ یائے معروف بین اللفظ بھی شائبۂ تلبیس سے خالی نہیں۔ پس بہتر ہے کہ اس کے

لئے یائے معروف کے حرف ماقبل کے نیچے زیر بنایا جائے۔ اس طرح یہ تلبیس بھی دُور ہو جائے گی۔

بہ نظر اختصار و تشریح میں پنجاب کا رسم خط[1] ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

۱۔ واو معروف۔ واو معروف کے ماقبل حرف پر پیش لکھا گیا۔ جیسے دُور

۲۔ واو مجہول۔ واو مجہول کے ماقبل حرف پر پیش نہیں لکھا گیا۔ جیسے زور

۳۔ حرف ماقبل مفتوح۔ حرف مفتوح پر وہیں زبر لکھا گیا ہے جہاں واو یا یَ کے معروف اور مجہول ہونے کا شبہ پڑتا ہے۔ جیسے غَور۔ سَیر

۴۔ یائے معروف۔ یائے معروف جو لفظ کے آخر ہے وہ دائرے کی لکھی گئی ہے۔ جیسے کشتی

۵۔ یائے مجہول۔ یائے مجہول کے ماقبل زیر نہیں لکھا گیا۔ جیسے دیر

۶۔ یائے ماقبل مفتوح۔ حسب تفصیل مثال مندرجۂ ۳

(۷۔ یائے مخلوط کے لئے کوئی قاعدہ نہیں بتایا گیا)

اس تفصیل کا اگر پروفیسر صاحب کی تجاویز سے مقابلہ کیا جائے تو بہ آسانی واضح ہوگا کہ بہ استثناء واو معروف یہ تمام تجاویز بعینہٖ پنجاب کے رسم خط کے مطابق ہیں۔ اسی مطابقت کے اتمام کے لئے میں نے اوپر یہ تجویز کیا ہے کہ یائے معروف کے اظہار کے لئے اُس کے حرف ماقبل کے نیچے زیر لگا دیا جائے۔ رہی یائے مخلوط؛ اس میں مجھے پروفیسر شروانی صاحب سے اتفاق ہے، نہ کہ مولانا ہاشمی صاحب سے۔

۲۔ پروفیسر صاحب نے میری پُرانی تجویز "فائے بلا نقطہ" اور "قاف بلا نقطہ" پر عدم فرق کا جو اعتراض کیا ہے، اِس سے مجھے سخت تعجب ہُوا۔ اِس کے جواب میں صرف اسی قدر عرض کرنے کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو فا اور قاف کی اصلی صورتوں میں ہے؛ بلکہ عدم نقاط سے یہ امتیاز اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

۳۔ مضمون کے آخر میں پروفیسر صاحب نے راقم الحروف کے "ہائے حروف" اور "حروف غنہ" کی تجویز پر ایراد کیا ہے۔ "حروف غنہ" کی تجویز محض مشروطی تجویز تھی: یعنی یہ کہ بقول ایک مضمون نگار صاحب کے اگر بچّوں کو

---

[1] رسم خط کی یہ تشریح پنجاب کے سرکاری مدارس کی تمام کتب کے سرورق کے اندر کی طرف درج ہوتی ہے۔ میں اُسی سے نقل کر رہا ہوں۔

غنّی حروف بھی پڑھائے جانے ضروری ہیں، تو کیوں نہ حروف غنہ کو باقاعدہ حرف تہجّی میں شامل کر دیا جائے۔ ورنہ
مجھے خود اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ رہی "حروف ہائے" کی تجویز۔ میں اس پر اب پھر قارئین کرام کی
رائے طلب کرتا ہوں۔ اس بارے میں بطور تشریح مزید اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ جس طرح سنسکرت، ہندی اور
ہندوستان کی دوسری مماثل زبانوں میں "ہائے حروف" حروف تہجّی میں شامل ہیں، کیا وجہ ہے کہ وہ بہ نظر تکمیل تہجّی
اردو میں شامل نہ کر لئے جائیں۔ اور جب ان مخلوط الہا، حروف کا اِملا "دوچشمی ھ" سے کیا جائیگا (جو بہترین صورت
اظہار ہے) تو یہ سوال ہی اُٹھ جائے گا کہ ایسی صورت میں املا کیوں کر ہو۔ مدارس میں چند سال کے تجربہ کے بعد مجھے
اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اِن حروف کو حروف تہجّی میں ضرور شامل کیا جائے، کیوں کہ ان مخلوط حروف
کی اصلیت اور کیفیت کے سمجھنے میں یہاں کے چھوٹے بڑے سب ہی کو ایک سخت مشکل کا سامنا سا رہتا ہے اور
ان کے لئے یہ مسئلہ نہایت عجیب و غریب ہے (گو خود ان کی دکھنی بول چال میں ایسے مخلوط الہا، حروف موجود ہیں،
اور بعض سادہ حروف بھی مسخ ہو کے گفتگو کے وقت مخلوط با لہا، ہو جاتے ہیں!)

اِسی ضمن میں پروفیسر صاحب نے "بای، تای، حای" (یہی نہیں، بلکہ "...... الخ" بھی) کی تجویز تفصیل
اعتراض کے طور پر کی ہے؛ خود پروفیسر صاحب سمجھ سکتے ہیں کہ نہ اردو میں ایسے خاص حروف ہیں، اور نہ اُن کی وہ
امتیازی حیثیت ہو سکتی ہے جو مخلوط الہا، حروف کی ہے جو بالکل طبعی اور اصلی ہیں۔

۴۔ مخلوط الہا، ملفوظ الہا، اور نون غنہّ کے الفاظ کے رسم الخط کے باب میں مجھے پروفیسر صاحب سے اتفاق ہے۔
بہر حال اگر یہ تمام تجاویز اختیار کی گئیں تو نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ پنجاب کا طریقہ رائجہ ہی اختیار ہوگا؟ اور میں
اس میں عیب تو کیا، خوبی اور سہولت ہی دیکھتا ہوں۔

قبل اس کے کہ میں اس مضمون کے حصۂ اوّل کو ختم کروں، رسم خط کے ایک اور اہم اور مختلف فیہ مسئلہ کی طرف
قارئین کو ملتفت کرنا چاہتا ہوں۔ میری مُراد ہائے مختفی کی اس حالت کے املا سے ہے جب کہ ہائے مختفی والے لفظ
کے بعد اور اُس سے متعلق ہو کر حروف مغیرہ (یعنی الفاظ میں، سے، کو، تک، پر، کا، کے، کی، والا) میں سے
کوئی آجاتا ہے۔ عموماً اس کی تحریر کی دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں: (۱) اس ہ کو ہا رہی کی صورت میں لکھا جاتا ہے،
جیسے "مقابلہ سے معلوم ہوگا"؛ (۲) اس ہ کو (زبان اردو کے اصلی تلفظ اور لہجہ کی بنا پر) یائے مجہول سے

بدل کر لکھا جاتا ہے، جیسے "مقابلے میں آؤ تو حقیقت معلوم ہو"۔ موخر الذکر صورت اِس وقت نہایت گراں گزرتی ہے جب اس طرح کی ہائے مختفی کے پہلے حرف عین (مہملہ) ہو، جیسے "جمعہ کے دن وعظ ہوگا"۔ "قرعے سے معلوم ہوا ہے کہ میری ہی باری ہے"۔ وغیرہ اِس لئے ایسی صورت میں عموماً دیکھا جاتا ہے کہ لکھنے والے بجائے صورت ثانیہ کے صورت اولیٰ ہی استعمال کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اِس بارے میں دو رائیں شاذ ہی متفق ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر اردو نویس لکھتے ہوئے (اور پھر دوران تحریر میں ہر موقعہ پر مختلف طریق سے) اجتہاد کر لیتا ہے، اور اس وقت جو کچھ اسلوب اسے بہتر یا مناسب معلوم ہوتا ہے اختیار کر لیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس کی غیر مطمئن اور صریحاً قابل اعتراض حالت پر ہر ایک ذی ہوش کو ضرور الجھن ہوتی ہوگی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اِس کا بھی جلد فیصلہ کر لیا جائے کہ ایسے موقعوں پر ہائے مختفی کو باقی رکھا جائیگا یا یائے مجہول سے بدل دیا جائیگا۔ میرے خیال میں مناسب اور اردو لہجہ کے شایانِ حال طریق یہ ہوگا کہ ایسی ہائے مختفی کو، جس کے بعد حروف مغیرہ میں سے کوئی حرف آئے اور اس سے متعلق ہو، یائے مجہول سے بدل دینا چاہیئے۔

میں جناب مولوی عبدالحق صاحب کی اِس تجویز کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں۔ مگر اس باب میں صرف

تجاویز جدیدہ۔(۱) پروفیسر شیروانی صاحب کے مضمون کے آخر میں فاضل اڈیٹر صاحب عالی جناب مولوی عبدالحق صاحب نے "نوٹ منجانب اڈیٹر" کے تحت میں ایک جدید اور نہایت دلچسپ مسئلہ پیش کیا ہے وہ یہ کہ "آیا اردو حروف تہجی میں ہم آواز حروف کے رہنے کی ضرورت ہے یا نہیں"۔ مجھے فخر ہے کہ اس بارے میں میرے خیال کو صاحب ممدوح سے کامل توارد ہوا۔ عرصہ سے میرا خیال تھا کہ "اردو" کے صفحات میں یہ بحث چھیڑی جائے۔ گو اس کی نوبت اب تک نہ آئی، مگر اکتوبر ۱۹۲۲ء کے آغاز میں مدراس کے ایک علمی جلسے میں مجھے زبان اردو کے متعلق کچھ کہنے کا موقعہ ملا تھا۔ اُس وقت میں نے مختصر طور پر (اور مزید توارد یہ ہے کہ بعینہٖ ان ہی دلائل اور جواباتِ اعتراضات کے ساتھ جو مولوی صاحب موصوف نے پیش فرمائے ہیں) حاضرین جلسہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ میں دَوران تقریر ہی میں بعض سامعین کے چہروں پر طرح طرح کے آثار دیکھ رہا تھا۔ تقریر ختم ہوتے ہی، میری توقع کے مطابق، دو چار حضرات نے اِس تجویز پر کچھ تو غیظ و غضب کا اظہار فرمایا، اور کچھ تمسخر و تضحیک سے کام لیا۔ اعتراض جو کچھ بھی کئے گئے، میں اُن کو خود ہی پیش کر کے جواب بھی دے چکا تھا۔ بہرکیف مجھے اِس امر کا اندازہ ہوگیا کہ کم از کم زباندانان مدراس ہرگز اس تجویز سے متفق نہ ہوں گے۔ واللہ اعلم

ایک اعتراض میرے خیال میں آتا ہے، جس کو میں ایک وقیع اعتراض سمجھتا ہوں۔ معلوم نہیں اور حضرات کی کیا رائے ہوگی۔ میں اختصار کے ساتھ اپنا خیال پیش کرتا ہوں:-

اِس میں شاید ہی کسی کو کلام ہوگا کہ قومیت اور عصبیت کے قیام و ثبات میں دو چیزیں سب سے زیادہ ممد و معاون ہوتی ہیں: مذہب اور زبان۔ بالفاظِ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ قوم کی حیات کے لئے اتحادِ مذہب اور اتحادِ زبان لابدی امور ہیں۔ اُردو زبان کے متعلق ہمارا متفقہ (اور بالکل صحیح) دعویٰ ہے کہ یہ ملک ہند کے مُسلمانوں کی زبان ہے؛ یعنی یہ کہ ہندوستان کی اس قوم کی متحدہ زبان ہے، جو مذہب اسلام کی پیرو ہے۔ اِس طرح ہندوستان کی اُردو گو قوم اِسلام پر متحد و متفق ہے؛ اور اس کے لئے کسی دلیل و برہان کی حاجت نہیں ہے کہ اِسلام اور اسلامیت کے اتّحاد کی بناء عربی زبان پر ہے۔ اب اِن عربی حروف (یعنی ذ، ض، ظ، ع وغیرہ) کے اخراج کی تجویز پر غور کرنے سے یہ امر بآسانی واضح ہوتا ہے کہ ہم اس تجویز کے اختیار کرنے سے اپنے حروف تہجّی (اور بنا بریں تمام اُردو الفاظ) میں سے خالص عربی حروف کو خارج کئے دیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اُردو گویانِ ہند (یعنی مُسلمانوں) کو پہلے تو قرآن کی تعلیم و تعلّم میں سخت تکلیف کا سامنا ہوگا؛ پھر عربی زبان کے حصول میں جو اشکال پیدا ہو جائیگا، اس کی وجہ سے قوم کا صرف ایک نہایت ہی محدود حصّہ عربی کی کتب وغیرہ سے مستفید ہو سکے گا۔ پھر دوسری طرف جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُردو میں عربی زبان کا کس قدر زبردست حصّہ موجود ہے، اور دن بہ دن (علاوہ یورپی زبانوں کے) اس کا عنصر اور بھی زیادہ دخیل ہوتا جاتا ہے اور باعثِ سہولت یہی ہے؛ تو وہ وقت کچھ دُور نظر نہیں آتا کہ فی الحال جس قدر الفاظ عربی کے اُردو میں موجود ہیں ان سے زیادہ کی درآمد مسدود ہو جائے گی، اور اگر کوئی مصنف، مؤلف یا مقرر اُن کو استعمال کرے گا تو وہ قارئین یا سامعین کو سخت دقّت میں ڈال دے گا۔ ان اسباب و وجوہ پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف اپنے مذہب اور مذہبی روایات کے تحفظ و بقاء کے لئے، بلکہ ایک حد تک خود زبان اُردو کی توسیع و ثبات کے لئے ان عربی حروف کا باقی رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔

اِسی ضمن میں ایک اور امر بھی ضروری طور پر غور طلب ہے جسے بہ لحاظ مقصد اسی تجویز کی ایک شق سمجھنا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ان عربی حروف کے زائد از ضرورت اور دوسرے حروف موجودہ سے (جن کو اہل اُردو بآسانی ادا کرتے ہیں) ہم آواز ہونے کی بناء پر خارج کر دینے کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی مناسب ہوگا یا نہیں کہ عربی کے جن

مرکبات میں اَل تعریفی ہوتا ہے (اور جن کا استعمال اُردو میں اسماءِ معروفہ کے طور پر بالخصوص اور دوسری طرح بالعموم ہوتا ہے) اُن کو عربی رسمِ خط کے مطابق نہ لکھا جائے بلکہ حرف لام کو لفظِ ماقبل کا آخری حرف خیال کیا جائے؛ یا اگر اس لام کے بعد کا حرف شمسی ہے تو وہی حرف لکھا جائے؛ مثلاً عبد العظیم کو ٹھیٹ اُردو لہجہ پر (حسب تجویز بالا) "اَبدُل ازیم" اور دار السلطنت کو "دارُس سلتنت" لکھا جائے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ایسا کرنا بہتر ہوگا؛ کیوں کہ عربی کے حرف زائدہ کا اخراج تمثیل تلفظ، سہولت املاء اور ازالۂ تلبیس پر مبنی ہے؛ اسی طرح عربی کے معرف باللام الفاظ کی اس نوع کی تقسیم و تقطیع بھی ان مقاصد کے حصول میں معاون ہوگی۔ فانظروا

بہرکیف اس دلچسپ موضوع پر دیگر حضرات اہل الرائے کی راؤں کو ضرور سُن لینا چاہیئے۔

۲۔ میں اسی سلسلہ میں ایک اور امر کی طرف اہلِ اُردو کی توجّہ کو مبذول کرانا چاہتا ہوں، اور وہ اوقاف قرأت کا مسئلہ ہے۔ گو اس کو رسم خط سے براہ راست کوئی تعلّق نہیں؛ لیکن اصلاح رسم خط کی بحث جس بناء پر مبنی ہے، اور جو غرض اس کی تحلیل سے متصوّر ہے، بلاشبہ اس میں اوقاف قرأت کا مسئلہ اس سے ضرور وابستہ ہے اور اس کے حل ہو جانے سے اِس کی تکمیل ہو جائے گی۔

زبان کی تحریر میں اوقاف قرأت کا ہونا ایسا امر ہے جس کی ضرورت سے کوئی صحیح الفکر انسان انکار نہیں کر سکتا۔ پھر بالخصوص اُردو کی تحریر میں ان کا نہ ہونا جن مشکلات کا باعث ہوتا ہے، وہ ہمیں معلوم ہی ہیں[۱] مگر نہایت حیرت کی بات ہے کہ اب تک اِس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ رسالۂ کہکشاں مرحوم (لاہور) میں مولوی سید ممتاز علی صاحب نے اِس تجویز کو پیش کیا تھا۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے، کسی اہلِ قلم نے اس پر قلم نہیں اُٹھایا۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو تحریروں میں چند ایک اوقاف ضرور استعمال ہوتے ہیں، مثلاً قامے (Commas) ہے جن کا وجود علامہ شبلی مرحوم اور دار المصنفین اعظم گڈھ کی کتب میں بالخصوص پایا جاتا ہے) قاماتِ معکوسہ، ندائیہ، سوالیہ اور معترضہ (خطوط وحدانی) مگر یہ استعمال یا تو بہت کم ہے یا (خصوصاً قامے کا حال تو یہی ہے کہ) غیر منضبط طور پر مستعمل ہے اور زیادہ تر کاتب صاحب کے رحم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میں تجویز کرتا

---

[۱] شاید شمالی ہند کے حضرات اِس سے پوری طرح متفق نہ ہوں گے مگر جنوبی ہند میں اور یہاں کے حالات و کوائف کے لحاظ سے اس قول کی جو اہمیت ہے، کاش کہ وہ اس سے آگاہ ہوتے۔

ہوں کہ تمام اوقاف قرأت کا استعمال اُردو تحریر میں جاری کیا جائے، اور اسی تفصیل اور تشدید سے جاری کیا جائے جیسا کہ انگریزی میں ہے۔

لہذا میں ذیل کی تجاویز ناظرین کے غور کے لئے پیش کرتا ہوں:-

ا۔ اوقاف اور اُس کے لئے رسم تحریر:-

(۱) انگریزی کے تمام اوقاف استعمال ہوں۔

(۲) تمام اوقاف کی وہی شکلیں ہوں جو انگریزی میں ہیں۔ مگر چوں کہ:-

ا۔ کامہ (Comma) اور سیمی کولن (Semi-Colon) میں واو اور ذال سے تشابہ ہوگا، اس لئے اُن دونوں کو انگریزی کی معکوس صورت میں اس طرح لکھا جائے (، ؛) :

(ب) سوالیہ کی شکل اُردو فقرے کے بعد الٹی سی معلوم ہوگی، اِس لئے اِس کا اس صورت میں استعمال کیا جائے جیسا کہ اُردو میں رائج ہے (؟)

ب۔ تسمیۂ اوقاف :-

اب سوال یہ ہے کہ ان کا مجموعی اور تفریدی نام کیا ہوگا۔ میں نے اب تک انھیں "اوقاف قرأت" کہا ہے ایران کے جدید فارسی والوں نے ان کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ وہ اس عمل کو "اعجام" اور اس کے مختلف اجزاء (قامہ وغیرہ) "اشاراتِ اعجام" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارے سامنے دو تیار بنے بنائے نام موجود ہیں: اوقاف اور اعجام۔ مجھے اِن میں سے اوّل الذکر پسند ہے، اور اِسی کے اختیار کرنے کی تجویز کرتا ہوں، اب رہی مختلف اوقاف کے نام، ذیل کی جدول سے اس کی تشریح ہوگی:-

علامت	فارسی نام	میری تجویز	انگریزی نام
،	سکتہ یا فاصلہ	قامہ	Comma
؛	مفرزہ یا نقطہ	مفرزہ	Semi-Colon
.	نقطہ یا قاطعہ	نقطہ	Period
:	دو نقطہ یا شارحہ	شارحہ	Colon

انگریزی نام*	میری تجویز	فارسی نام	علامت
Hyphon	رابطہ	رابطہ	-
Dash اور	ڈَیش	فارقہ	—
Parenthesis ،	معترضہ	معترضہ	( )
Brackets	تفریقیہ	تفریقیہ	[ ]
Query	سوالیہ	استفہامیہ	؟
Interjection	ندائیہ	تعجبیہ	!
Dots of omission	نقاط تقدیریہ	نقاط انصرافیہ یا تقدیریہ	....
Inverted Commas	قامات معکوسہ	ممیزہ	" "

ان میں سے پہلے دو اوقاف کے سوا سب تحریر کی سطر پر بنائے جائیں، اور پہلے دو سطر کے اوپر یعنی تحریر شدہ الفاظ کے حصۂ اعلیٰ کے برابر۔ اس تجویز کے متعلق میں دیگر حضرات کی رائے کے لئے چشم براہ رہوں گا۔ اوقاف کے جو نام میں نے تجویز کئے ہیں، فارسی اسمار کے مقابلے سے معلوم ہوگا کہ سوا پانچ صورتوں کے باقی سب فارسی ہی سے مقتبس ہیں۔ لیکن اگر ان سے بہتر اور سہل تر نام تجویز ہوں تو میں اپنے مجوزات پر زور نہ دوں گا۔ صرف اس قدر البتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اسمار ان اوقاف کے فعلِ ذاتی کے مُظہر بھی ہیں، اور بہتر ہو کہ حضرات مجوزین اس امر کو ضرور پیشِ نظر رکھیں۔ میں نے اپنی کتاب "خلافت مُوحدین" میں ان تمام اوقاف کا باقاعدہ استعمال کیا ہے: اور جہاں تک مجھے خیال ہے یہ کتاب اُردو ادبیات میں پہلی ہی کتاب ہے جس میں یہ التزام کیا گیا ہے۔

پروفیسر شروانی صاحب اور مولانا مولوی عبدالحق صاحب کی اس تجویز پر میں بار بار زور دینا چاہتا ہوں کہ رسم خط کے متعلق جب تمام آرار وصول ہو چکیں، تو پروفیسر صاحب کی مجوزہ جماعتوں سے ایک یا زائد نمائندہ کو طلب کر کے ایک باقاعدہ جلسہ کیا جائے، جس میں یہ تمام تجاویز معرض بحث میں آئیں۔ پھر جو کچھ طے پائے اس کو انجمن ترقی اُردو کی جانب سے وسیع پیمانے پر شائع کیا جائے، اور زور دیا جائے کہ آئندہ تمام مطبوعات اِسی اسلوب پر ہوں۔ اب

دیکھنا یہ ہی کہ اِس میں اہلِ اُردو کہاں تک سرگرمی سے کام لیتے ہیں۔

جیسے

(از جناب سید الطاف حسین صاحب کاظم۔ دہلی)

رسالہ اُردو ماہ جولائی ۱۹۲۱ء میں ایک مفید و دلچسپ مضمون ہماری نظر سے گزرا تھا جو عزیزی و سعیدی مولوی ہمی صاحب فریدآبادی کے ذہن نقّاد کا نتیجہ ہی۔ یہ مضمون عبداللہ یوسف علی صاحب کے مضمون تجویز اصلاح الخط کے جواب میں لکھا گیا ہی اس لئے اس مضمون کا بھی یہی عنوان رہا۔ حالاں کہ جن مسائل پر مضمون مذکور میں بحث کی گئی ہی اُن کے لحاظ سے عنوان کچھ اور ہونا چاہیئے تھا۔

اگرچہ پہلا مضمون ہمارے سامنے نہ ہونے کے باعث ہمیں خوف ہی کہ شاید ہم اس مفید مسئلہ پر خاطر خواہ اپنے خیالات کا اظہار نہ کرسکیں گے، تاہم اس اُمید پر کہ مضمون ہذا شائع ہونے کے بعد غالباً دونوں صاحبوں کی نظر سے گزرے گا۔ ممکن ہی کہ تبادلہ خیالات کا کوئی سلسلہ قایم ہوسکے حتی المقدور ہم اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں جو مجیب و معترض دونوں کے خیالات سے علٰحدہ ہیں۔

عزیزی مولوی سید ہاشمی صاحب نے اصل مضمون کے پہلے حصّہ کے متعلق لکھا ہی کہ عبداللہ یوسف علی صاحب کی رائے ہی "مرکب الفاظ کے جو اجزا ترمیم ہوکر اب مستقل لفظ نہیں رہی ان کو علٰحدہ علٰحدہ لکھنا چاہیئے" مگر ہم کو اس سے اختلاف ہی۔ ہمارے نزدیک پَن گھٹ کو ملاکر (پنگھٹ) لکھنا چاہیئے۔ البتہ وہ اجزاء مرکبات جو اصلی حالت میں بامعنی لفظ ہوں وہ جُدا جُدا لکھے جانے مناسب ہیں۔ جیسے کام چور، شیخی خور۔

ہمارے نزدیک سید ہاشمی صاحب کی رائے بالکل دُرست ہی اور اُردو رسم کتابت کے لئے یہ قاعدہ بالکل موزوں و مناسب ہی۔ اُمید ہی کہ عبداللہ یوسف علی صاحب نے بھی اس کو پسند فرمایا ہوگا۔

اصل مضمون کے دوسرے حصہ کے متعلق جو جواب دیا گیا ہی اس سے معلوم ہوتا ہی کہ مضمون کا یہ حصّہ رسمِ خط کے نسبت علم ہجا سے زیادہ تعلق رکھتا ہی۔ اِس پر سید ہاشمی صاحب نے مختصراً و مجملاً وہی لکھا ہے جو ہم اُردو قاعدہ کے دیباچہ میں مفصلاً لکھ چکے ہیں یعنی یؔ اور وؔ مجہول پر کوئی حرکت موافق یا مخالف نہ سمجھنی چاہیئے اور ہجّے کراتے وقت بچہ کو ذہن نشین کرادینا چاہیئے کہ ایسی واؤ یا یا کے ماقبل حرف پر زبر زیر پیش کچھ نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ صرف حرف علت ہی کی وجہ سے یہ وسطی آواز پیدا ہو جاتی ہی۔

اُردو زبان میں یاء ساکن کی عموماً تین آوازیں ہیں۔ سَیر۔ سیر۔ سِیر جن میں سے صورت سوم کو یاء معروف اور دوم کو مجہول کہا جاتا ہی صورت اوّل کا کچھ نام نہیں ہی۔ اس لئے عربی فارسی میں خواہ کچھ ہو اُردو کی تقسیم اس طرح مناسب ہو گی کہ اوّل کو مجہول دوم کو وسطی سوم کو معروف کہا جائے۔

حروف علّت کی خاصیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ الف زبر کا دوچند ہوتا ہی اور یاء زیر کا اور واؤ پیش کا۔ نیز یہ بھی ثابت ہی کہ زبر تینوں حرف علّت کے ماقبل پر آجاتا ہے الف کے ماقبل پر حرکت موافق کی طرح اور واؤ اور یاء کے ماقبل پر مخالف حرکت کے طور پر مگر زیر اور پیش حرکت مخالف کے طور پر کسی حرف علّت کے ماقبل پر کبھی نہیں آتے صرف موافق حرکت بن کر آتے ہیں۔ چنانچہ الف کے ماقبل پر زبر کے سوا زیر یا پیش کا ہونا محال ہی اور واؤ اور یاء کے ماقبل پر زبر کا ہونا ممکن ہی۔ لہٰذا یاء مجہول وہ یاء ہی جس کے ماقبل پر زبر ہو جیسے سَیر یاء معروف وہ یاء ہی جس کے ماقبل پر زیر ہو جیسے سِیر یاء وسطی وہ یاء ہی جس کے ماقبل پر کچھ نہ ہو جیسے سیر آگے چل کر مضمون زیرِ غور میں حروف تہجّی کی بحث چھڑ جاتی ہی اور سید ہاشمی صاحب لکھتے ہیں کہ دو چشمی ھ کے حروف ثقیلہ (بھ۔ پھ۔ تھ وغیرہ) بڑھا کر پنجاب والوں نے ایک اور بے اصولی پیدا کر دی ہی۔ عربی و فارسی میں تو ان آوازوں کی ضرورت نہیں تھی جو ہماری تحریر کے اصل واضعین ان کے لئے خاص حروف وضع کرتے۔ ہاں ہندی زبان میں ایسے بہت الفاظ ہیں جن میں دو حرف کی مل کر ایک آواز پیدا ہوتی ہی ہمارے نزدیک یہ الفاظ دبی زبان سے اس امر کا اقرار ہی کہ حروف ثقیلہ حروف تہجّی میں شامل ہونے چاہیئں کیوں کہ عربی و فارسی کے اس قدر دیرینہ قبضہ پر اور انگریزی و ترکی کی اس یلغار پر روزمرۂ اُردو میں ہندی الفاظ کی تعداد چند در چند ہی ان حالات پر اصل واضعین کا فرض تھا کہ ان آوازوں کے لئے حروف وضع کرتے اگر ایسا نہیں کیا تو فرض ادا نہیں کیا اسی غفلت کا نتیجہ ہی کہ اُردو علم ہجا میں لاعلاج مشکلات پیدا ہو گئی ہیں چنانچہ آج لفظ ہَنس اور ڈَنڑ کے ہجے کوئی طالب علم تو کیا مطلوب علم بھی نہیں کر سکتا۔ آخر مجبور ہو کر یہ کوشش کی جاتی ہی کہ ہجّوں کا طریقہ بدلا جائے۔ لیکن جب حروف ثقیلہ اور حروف غنّہ کا بڑھانا اس لئے ناجائز ہی کہ اصل واضعین نے اُن کو شامل نہیں کیا ہی تو اس مقدّس خیال کی بنا پر ایسے ہجّوں کا جاری کرنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہی جو اصل واضعین کے طریقہ خلاف ہوں گے۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ حروف ثقیلہ اور غنّہ بڑھا کر بہت سے لاینحل مسئلوں کو طے کر دیا جائے جس سے تمام مشکلات کا خاتمہ ہو جاتا ہی اس کے بعد مونث

سید ہاشمی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ ھ ۔ ن ۔ یٓ تین حرف ایسے ہیں کہ دوسرے حرفوں کے ساتھ مل کر اُن کی جداگانہ ہستی قایم نہیں رہتی۔ یہ بات ھ اور ن کی نسبت بالکل درست ہی مگر یٓ کی نسبت ہمیں کلام ہی اور ہم سید صاحب کو اِس پر دوبارہ غور کرنے کی تکلیف دینا چاہتے ہیں۔ کیاری۔ پیاری۔ پیاس۔ بیاج وغیرہ جن الفاظ میں سید صاحب نے خیال کیا ہی کہ یٓ کی ہستی قایم نہیں رہتی اُن سب میں یٓ کی ہستی تو بخوبی قایم رہتی ہے مگر یٓ کے ماقبل حرف کی آواز آدھی رہجاتی ہی۔ اِس کی بابت اُصولاً یوں سمجھنا چاہیئے کہ حرف یا کسی سے ملتا ہی یا کسی کو ملاتا ہی۔ ایک کو متحرک کہتے ہیں دوسرے کو ساکن؛ اس ساکن و متحرک کی بقاعدہ حصر عقلی چار صورتیں ہوتی ہیں جن میں سے کسی نہ کسی میں ہر حرف کا ہونا لابد ہی۔ وہ چار صورتیں یہ ہیں ۔

(۱) فقط متحرک جیسے نقّال کا نون

(۲) فقط ساکن " " " الف

(۳) متحرک بھی ساکن بھی (مُشدّد) " " " قاف

(۴) نہ متحرک نہ ساکن (موقوف) " " " لام

جس طرح مشدّد اور ساکن کبھی کلمہ کے شروع میں نہیں آتے اسی طرح متحرک اور موقوف کلمہ کے شروع میں آتے ہیں۔ اِس حالت میں موقوف کا نام ہم نے مُعرّا رکھا ہی جس سے مُراد یہ ہی کہ اِس پر زبر زیر پیش کچھ نہیں ہوتا۔

پیار۔ پیاس وغیرہ الفاظ میں پ حرف سر کلمہ مُعرّا ہی اور اِسکی ہجّوں میں کوئی حرکت نہیں دینی چاہیئے صرف حرف کا نام لینا کافی ہوتا ہی عجیب و دلچسپ بات ہی کہ ایسے مُعرّا سر کلمہ ہمیشہ بلا استثنا دو تین حرف علت کے قبل آتے ہیں جیسے پیار۔ کوار اور اس واؤ یا یٓ کے بعد الف بھی ضرور رہتا ہی۔ اُردو میں حرف علت اور حرکت کے تعلقات اگر مکمّل طور پر قلمبند کئے جائیں تو زبان عربی کے تعلیلات سے کم نہ رہیں گے۔ چنانچہ آواز کا تفاوت ایک اور بھی نہایت قابل لحاظ ہی۔ کوڑی۔ اور کوّا دو لفظ ہیں جن کے اوّل میں دونوں جگہ کاف مفتوح مع حرف علت واؤ موجود ہی فرق صرف یہ ہے کہ کوّا کا حرف علت مُشدّد ہے اور کوڑی کا حرف علت ساکن ہی اِسکا اثر یہ ہی کہ کوڑی میں تو کاف زبر واؤ کو کہا جاتا ہی اور کوّا میں ان ہی دو حرفوں کی آواز گینند کی طرح لڑھکتی ہُوئی نکلتی ہی۔ جب ہجّے ہوتے ہیں۔ پھر فقط کوّا میں ہی نہیں بلکہ کُلّیہ کے طور پر جہاں دو متواتر حرف

علت جمع ہوجاویں گے اور پہلا حرف علت مشدّد اسی طرح کی آواز پیدا ہوجائے گی جیسے پیّا اور پیَیا دونوں میں پَ مفتوح مع حرف علت یَ موجود ہی مگر ہجّوں میں آوازیں مختلف ہیں۔

بات یہ ہی کہ انسان نے حروف تہجّی بول کر زبان نہیں سیکھی ہی بلکہ جملے بولے ہیں۔ اِس لئے خالص مفرد حرف کی آواز ادا کرنا اِس کے فطرت کے خلاف ہی اور کیسا ہی تکلف کرکے حرف کی خالص آواز ادا کرنا چاہے خود بخود اِس حرف پر کوئی حرکت تلفظ میں پیدا ہوجائے گی؛ حرف مفرد بلا حرکت صرف اِسی صورت میں ادا ہوسکتا ہی جب کہ اِس کے بعد واؤ یا یَ حرف علت ہو اور اِس کے بعد الف بھی ہو۔ جیسا کہ پیار کی پ اور کوار کا کاف اور بیاج کی بے۔

حرف استفہام (کیا) اور کرنا کی ماضی مطلق (کیا) پر غور کیجئے؛ یَ دونوں کے تلفظ میں صحیح و سالم موجود ہی مگر جس طرح ماضی مطلق (کیا) کا کاف صاف معلوم ہوتا ہی حرف استفہام (کیا) میں نہیں معلوم ہوتا بلکہ آدھا رہ جاتا ہی اور بیشک آدھا رہ جانا چاہیئے۔ کیوں کہ وہ موقوف یا مُعرّا ہی اور جب کہ مشدد متحرک بھی ہوتا ہے اور ساکن بھی اس لئے دو چند حرف ہوتا ہی تو موقوف یا مُعرّا جو نہ متحرک ہوتا ہی نہ ساکن حساب سے نصف رہنا چاہیئے۔

تعجب ہی اور سخت تعجب ہی کہ ایسے حروف سر کلمہ کو پنجاب یونیورسٹی کے منظور شدہ اُردو قاعدوں میں ساکن لکھا ہی۔ حالاں کہ ساکن حرف سر کلمہ ہونا محال ہی کیوں کہ ساکن سے پہلے ایک متحرک کا ہونا لازمی امر ہی

جس طرح حرف مفرد محض کا تلفظ کرنے میں خود بخود کوئی حرکت پیدا ہوجاتی ہی۔ اسی طرح حرف مفرد متحرک محض کا تلفظ کرنے میں خود بخود اس حرکت کا مماثل کوئی حرف پیدا ہوجاتا ہی۔ اسی لئے ہم نے اپنے جدید قاعدہ میں اُستادوں کو تاکید ہدایت کی ہی کہ قُطب کے ہجّوں میں قاف پیش قو طے پیش تو بے طب توطب بچے نہ کہنے پائیں۔ بلکہ قاف پیش طے پیش بے ایک دم قُطب کہنا چاہیئے۔ مضمون کے آخر میں مولوی سیّد ہاشمی صاحب نے ہجّوں کا طریقہ بتایا ہی۔ وہ کہتے ہیں گھرکے ہجے اِس طرح کرائے جائیں۔ گ ہ پر الٹا جزم گہ (تلفظ گھ) اور گہ رَ زبر گھر گویا حروف ثقیلہ اور غنّہ تہجّی میں نہ بڑھائے جائیں۔ بچے خود اُسی وقت اوّل حرف ثقیل بنالیا کریں پھر ہجے کرلیا کریں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غُنّہ اور ثقیل تمام آوازوں سے بچے عرصہ دراز میں رفتہ رفتہ آشنا ہوں گے حالاں کہ اُصولاً تمام مفرد آوازیں اور ان کی شکلیں حروف تہجّی ہی میں آجانی چاہئیں۔

اگر یہ صرف اس لئے گوارا ہی کہ حروف تہجّی زیادہ نہ ہونے پائیں تو ہمارے نزدیک حروف صحیحہ میں سی بہت سے کم ہوسکتے ہیں۔ اُن کے کم کرنے کی طرف توجہ کیوں نہیں کی جاتی۔

اگران بحثوں کے وقت ہمارا دیباچہ سامنے رکھ لیا جاوے تو بہت سا وقت ضائع ہونے سے بچ جائیگا اور مُباحث جلد کسی مستقل نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔

آخریں مولوی سید ہاشمی صاحب سے ہمنوا ہوکر ہم بھی عرض کرتے ہیں کہ کسی نئے قاعدہ کو منتخب کرنا اور تمام صوبوں کے تعلیمی محکموں سے خط وکتابت کے بعد اس کو کتب درسی میں رواج دینا انجمن ترقیِ اُردو کا کام ہی ورنہ کوئی تجویز یا اصلاح اُردو تحریر میں عام طور پر مروّج و مستعمل نہیں ہوسکتی۔

تنقید

(از جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی۔ پرنسپل عثمانیہ کالج۔ حیدرآباد۔ دکن)

ارابشِ زِنٹاکس یعنی "عربی نحو" تصنیفِ ہ۔ ریکین دورف۔ اشاعت خانۂ کارل وِنٹر، ہائیڈل بزگ (جرمانیا) ۱۹۲۱ء ۸ + ۵۵۷ صفحے قیمت: تقریباً ۱۸ روپے۔

(Die Arabische Syntax von H. Reckendorf
Carl Winter, Heidelberg, GERMANY)

اِس مالی مصیبت کے زمانے میں جرمانیوں کی علمی اولوالعزمی پر ہزار آفریں کہ ایسی کتابیں بھی برابر شائع کررہی ہیں جن کے پڑھنے والوں کی تعداد اُس ملک میں بہت محدود ہی اور اس لئے اُن کی اشاعت سے کسی مالی فائدے کی زیادہ اُمید نہیں۔ اسی زمرے میں جامعۂ فرائی بُرگ (Freiburg) کے سامی لسانیات کے اُستاذ، پروفیسر ہ۔ ریکین دورف کی تازہ تصنیف "عربی نحو" بھی شامل ہی۔

اِس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے تک مصنفِ موصوف کی دو اور تصنیفیں بہت مشہور تھیں۔ ایک پارونومزی اِن دین زمی ٹشین اشپراخین (Die Paronomasie in den semitischen Sprachen) یعنی "سامی زبانوں میں تکرار" دوسرے (Die Syntaktischen Verhältnisse des Arabischen) یعنی "عربی کے نحوی تعلقات (یا کیفیات)" اِس دوسری کتاب کا موضوع بھی گویا وہی ہو جو کتاب زیرِ تبصرہ کا لیکن دونوں کے طرزِ بیان اور احاطۂ عمل میں بڑا فرق ہی۔ شواہد کا مواد جو دونوں میں جمع کیا گیا ہی وہ بھی ایک نہیں۔ غرض کہ ایک کتاب دوسری سے مُستغنی نہیں کرتی بلکہ دونوں ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب دو حصّوں میں تقسیم کی گئی ہی: پہلے میں سادہ جملوں اور اُن کے مختلف اجزا کا بیان ہی اور دوسرے میں مُرکّب یا ملتف جملوں کی تشریح۔ پھر ہر حصّے میں چند فصلیں ہیں۔ ہر فصل کے آغاز پر اُس کے متعلق عام نحوی اصطلاحیں اور اُز ضروری مراتب جرمانی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھ دیئے ہیں۔ اور پھر عرب کے مستند کلام سے شواہد جمع کرکے اُن کو صحیح عنوانوں کے ذیل میں جگہ دی ہی اور ہر شاہد کا احتیاط کے ساتھ حوالہ بھی دیا ہی۔ یہ پُرمغز کتاب ساری کی ساری طول و فضول سے مُعرّا ہی اور ترتیب ایسی خوب ہی کہ استفادہ کرنے والے کو بے ضرورت لفظوں اور پیچیدہ جملوں کی بھول بھلیاں میں پڑے بغیر مطلوبِ مقصود ہاتھ آجاتا ہی۔ شواہد اور تمام عربی لفظ عربی ہی خط میں لکھے ہیں اس لئے یہ کتاب اُن لوگوں کے لئے بھی ہرگز بے کار نہیں جو جرمانی نہیں جانتے اور اِسی لئے میں نے مناسب جانا کہ ''اُردو'' کے ذریعے اُن حضرات کو بھی جو جرمانی نہیں پڑھ سکتے اِس بیش بہا خزانے کی خبر پہونچا دوں۔

حیدرآباد کا ایک مشاعرہ

گزشتہ ماہ فروری میں ہمیں حیدرآباد کے ایک مشاعرہ میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ عام مشاعرہ نہ تھا بلکہ بے تکلف اور سخن سنج احباب کی ایک دلچسپ صحبت تھی جس میں بعض غیر طرحی غزلیں بھی پڑھی گئیں۔ مصرع طرح:

"کہاں سے لائے گا قاصد بیاں میرا زباں میری"

ایک پامال زمین تھی مگر اس میں بھی بعض حضرات نے بہت اچھے اچھے شعر کہے تھے۔ ہماری درخواست پر بعد میں قریب قریب سب غزلیں ہمارے پاس بھیجدی گئیں کہ ناظرین اُردو کی دلچسپی کے واسطے ہم ان غزلوں کے منتخب اشعار اس رسالے میں شائع کردیں۔

مشاعرے میں سب سے زیادہ داد حکیم عابد حسین صاحب عابدؔ کے حصے میں آئی۔ آپ لکھنؤ کے ایک نامور خاندان کی یادگار ہیں اور غزل نہایت خوب لکھتے ہیں۔ زبان کی سلاست وصفائی کے علاوہ جو تغزل کی جان ہے، حضرت عابدؔ کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کا کوئی شعر سوز وگداز کی کیفیت سے خالی نہیں ہوتا۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں:-

کہانی رنج وغم کی اور پھر طرزِ بیاں میری! — بہت روئے وہ سُن کر میرے مُنہ سے داستاں میری

الٰہی کس طرح فریاد پہنچے اُن کے کانوں تک — کہ بیگانہ ہے راہ ورسم منزل سے فغاں میری

اُٹھا تھامے ہوئے دل، اُٹھ کے بیٹھا، بیٹھ کر اُٹھا! — تری دہلیز پر اللہ رے بیتابیاں میری

ہزاروں خوبیاں ہیں ایک مرجھائے ہوئے دل میں — بہارِ گلشنِ عالم سے بہتر ہے خزاں میری

خدا سمجھے نشانِ قبر بھی رکھا نہ ظالم نے — یہ میری بیکسی اور اس پہ یہ بربادیاں میری

کوئی تازہ مصیبت سر پہ شاید آنے والی ہے — بہت جُھک جُھک کے صورت دیکھتا ہے آسماں میری

وقارِ عشق ہے بے آبرو ہونا محبت میں — مرا سرمایۂ عزت نہیں بے تابیاں میری

خداوندا تہِ خنجر بھی گویا ہو زباں میری — یہ حسرت ہے دعا دوں ذبح ہوتے ہوتے قاتل کو

مصیبت کا ہے افسانہ غزل کا ہے کو ہے عابد
مرصع ہے غم و رنج والم سے داستاں میری

سلاستِ بیان اور تغزل کے ذکر میں ہمیں اپنے عزیز میزبان اور صاحبِ مشاعرہ سید نثار احمد صاحب مزاج کے شعر یاد آئے۔ آپ حضرت داغ مرحوم کے شاگرد ہیں اور اس خصوصیت میں اپنے باکمال اُستاد کے سچے وارث ہیں کہ محض سلاست اور حسنِ بیان کے زور سے شعر میں لطف وحلاوت پیدا ہوجاتی ہے۔ ہم نے طوالت کے خوف سے طرح کی غزل میں سے حضرت مزاج کے صرف چند شعر انتخاب کرنے پر اکتفا کی:۔

وہاں عرضِ تمنا پر بھی رُکتی ہے زباں میری — زبانِ خامشی تو ہی سُنا دے داستاں میری
تمنا مجھ پہ ہنستی ہے وہ ناکام تمنا ہوں — حقیقت ہے عزیز و عبرت آموزِ جہاں میری
اثر ہے اضطرابِ شوق کا دونوں طرف یکساں — تڑپ ہے اُن کے جلوے کی کہ ہیں بیتابیاں میری
مری چشمِ تماشا محوِ خوابِ زندگانی ہے! — خیالِ یار سے ہوتی ہیں بزم آرائیاں میری
میں مرنے کے لئے جیتا ہوں جینے پر نہیں مرتا — سُنا اہلِ ہوس! یہ ہے حیاتِ جاوداں میری
جب اپنوں کی یہ حالت ہو تو غیروں کی شکایت کیا — یہ دل ہے مدعی میرا یہ دشمن ہے زباں میری

دو اور صاحب جن سے مشاعرے کی زینت ہے اور جن کے بغیر اس محفل یاراں میں پوری رونق نہیں آتی حضرت ضامن کنتوری اور صاحب عالم مرزا نظام شاہ صاحب لبیب دہلوی ہیں۔ حضرت ضامن اردو اور فارسی کے قادر الکلام اور مشہور مشاق سخن گو ہیں اور ان کے شعر میں اُستادانہ پختگی کی شان موجود ہے۔ ہمیں ان کا اُردو دیوان 'ارتنگ خیال' حال ہی میں ملا اور اُمید ہے ان کی شاعری کے متعلق ہم کسی آئندہ موقع پر اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کرسکیں گے۔ ہمارے مخدوم مرزا نظام شاہ صاحب کا رنگ دوسرا ہے اور تصوف کے تازہ ذوق نے ان کے شعر میں کچھ اور ہی کیف واثر پیدا کردیا ہے۔ ذیل میں دونوں صاحبوں کے بعض شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

حضرت ضامن کنتوری :-

یہ اندیشہ ہے حق کو کہ کر نہ جائے مفت جاں میری
کرو اقرار جاں بخشی تو گویا ہو زباں میری

عجب کیا گر سنے وہ بزم عشرت حلقۂ ماتم
زباں تیری ہو لے افسانہ گو اور داستاں میری

بہارِ رنگِ رُخ ایسا نہ ہو کافور ہو جائے
کسی سے کیوں کہے کوئی حدیثِ خونچکاں میری

فنائے آب و گِل سے کیا ضرر صاحب کمالوں کو
قضا کے جور سے ایمن ہے عمرِ جاوداں میری

حضرت لبیب دہلوی :-

نہیں گردش میں کچھ کم چرخ سے عمرِ رواں میری
کہ ہر دم اک بہار نو دکھاتی ہے خزاں میری

مٹایا اس قدر اُس کی خرام ناز نے یارب
کہ باقی ہے فقط اب داستاں ہی داستاں میری

فنا ہے ماضی و مستقبلِ زندانیاں، لیکن
نمودِ ہستی فی الحال ہے اک چیستاں میری

مجھی سے اے بہارِ جاں فزا آباد ہے گلشن
تری نیرنگیوں کی جان ہیں بیتابیاں میری

لبیب اس بام پر چڑھنے کی جتنی جستجو کیجیے
ہوئی جاتی ہے اُتنی ہی فروتر نردباں میری

خوانِ مشاعرہ کے ان مزے مزے کے کھانوں میں اچار اور چٹنی کی کمی حضرت چچا کی غزل پورا کرتی ہے -
یہ بزرگ، سید اسحٰق احمد صاحب نام، دھلی کے پیرزادے اور شاید اس تخلص کی بدولت ساری دنیا کے چچا بن گئے ہیں -طبیعت میں نہایت ظرافت ہے -آپ کی غزل نہ ہو تو مشاعرہ بے دودھ کی چائے رہ جائے - دو مضمون آپ کے خاص ہیں اور شاید دونوں خود آپ کے تلخ تجربے پر مبنی ہیں -یعنی ایک تو اطبائے حیدرآباد کی خطرناک نومشقی اور ایک چاندنی رات کی چوریاں، کہ اور سب جگہ تو اندھیری راتوں میں چور پڑتے سنتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے حیدرآباد میں حضرت چچا کو اس کے برعکس سابقہ پیش آیا- طرح کی غزل میں آپ کے چند شعر یہ ہیں :-

بھلا کہئے تو کیوں سننے لگا پاسباں میری
مجھے بولے کے خود ہی آپ سن لیں داستاں میری

اندھیرا ہی بھلا ہے میں اسی کی قدر کرتا ہوں
شبِ مہتاب میں اکثر ہوئی ہیں چوریاں میری

جنابِ شیخ مجبوری ہے اب تو دال حاضر ہے | کہ سب کام آگئیں نوبت بنوبت مرغیاں میری
تلیٹھی، کاسنی کتکبا، کہاں تک خطمی و خیری | دوائیں اب تو بدلوائے حکیمِ جاں ستاں میری

لیکن ہمیں سب سے زیادہ خوشی خاص حیدرآبادی شعرا کا کلام سُنکر ہوئی۔ تین صاحبوں کی غزلیں جو مشاعرے میں پڑھی گئی تھیں ہمیں ملی ہیں۔ ان میں سے غلام یٰسین خاں صاحب جمعدار نظم جمعیت کی غزل میں "آشیاں" کے قافیے تین جگہ نہایت خوبی سے نظم ہوئے ہیں :-

رہیگا بعدِ بربادی بھی باقی یہ نشاں میرا | اُڑیگی مدتوں گلشن میں خاکِ آشیاں میری
نہیں ہے گلشنِ عالم سے سرسبزی مقدر میں | جو سوکھی ہو چمن میں ہے وہ شاخِ آشیاں میری
رِہا ہوکر قفس سے بے پروبالی قیامت ہے | نظر اُٹھ اُٹھ کے رہ جاتی ہے سوئے آشیاں میری

دوسرے صاحب، سید علی نواز رضوی، حیدرآباد کے ایک نامی گرامی خاندان کی یادگار ہیں۔ فکر میں بلندی اور طبیعت میں جدّت ہے۔ اگر مشق و ترقی جاری رہی تو کیا عجب ہے کہ ایک طرز خاص کے مالک ہو جائیں۔ آپ کی غزل طرحی میں سے بھی ہم نے صرف چند شعر چُنے :-

دلِ روشن یہ کہتا ہے نہیں ہے ضَو کہاں میری | یہ ساری بزمِ امکاں کی ہیں شمعیں جھلکیاں میری
تو اتنا کِھل کہ سب تجھکو گُلِ زخمِ جگر سمجھیں | اسی میں شادمانی ہے دلِ ناشادماں میری
رہا ناکامِ منزل قافلہ شاید تمنّا کا | صدائے آہ ہے بانگِ درائے کارواں میری
پکار اُٹھا ہے دل "اللہ اکبر" گر کے قدموں پر | نمازِ عشق ہے سجدے میں ہوتی ہے اذاں میری

حضرت ساقی حیدرآبادی سے مشاعرے کے اکثر حاضرین واقف نہ تھے۔ لیکن جب آپ نے اپنی غیر طرح کی غزل سُنائی تو صدائے تحسین و آفریں سے مشاعرہ گونج اُٹھا اور سب متعجب رہ گئے کہ حیدرآباد میں ایسا باکمال شاعر بھی پردۂ گمنامی میں چُھپا ہوا ہے؟ یہ ساری غزل کچھ ایسی مسلسل اور مرصع ہے کہ ہم نے اس میں قطع و برید

کرنا ظلم سمجھا اور پوری غزل ذیل میں نقل کر دی۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں :-

مجازاً ہی سہی لیکن حقیقت کو عیاں کر دے
بس اب اے جذبِ الفت ختم بحثِ این و آں کر دے

حریمِ ناز میں اتنا کرم کر جلوۂ جاناں
بھلا دے غمگساری راز داں کو بدگماں کر دے

یہ وقتِ امتحاں ہی جلوہ فرمائی سے کچھ پہلے
شکیبائی کو دزدیدہ نگہ سے نیم جاں کر دے

وہ ہرجائی ہی اے جذبِ تصوّر کام کر اپنا
ہماری بیخودی کو پردہ دارِ لامکاں کر دے

بھٹک کر تیری منزل سے قدم گر جادہ پیما ہو
مٹا دے، خاک کر دے، خاک گردِ کارواں کر دے

سوا ہوں جورِ عالم سے دلی سرگرمیاں میری
جہاں کی سرد مہری سے فزوں سوزِ نہاں کر دے

ترے بیمارِ الفت کی اگر قسمت میں صحت ہو
مداوا کا اثر یا رب نصیبِ دشمناں کر دے

مٹا دے اعتبارِ زندگی کو جیتے جی میرے
مرے قصے کو ہم عنوانِ یادِ رفتگاں کر دے

تری الفت کا دم بھرنے میں دم بھر کی جو غفلت ہو
نویدِ زیست کو پیغامِ مرگِ ناگہاں کر دے

مرے سوزِ نہاں کو کیا ہی نسبت آتشِ گل سے
منوّر طور کی تجلی سے میرا آشیاں کر دے

تُلے جس روز میزانِ عمل میں جنسِ عصیاں کی
بقدرِ وسعتِ رحمت مرا پلّہ گراں کر دے

فلک کی شعبدہ بازی سے عاجز آ گیا ساقی
الٰہی رحم کر۔ برہم طلسمِ جسم و جاں کر دے!

راقم "تماشائی"

تبصرہ

اُردو زبان کی جدید مطبوعات

ادب

مجموعۂ کلام جوہر:

مولانا محمد علی صاحب (آکسن) کے اُردو کلام کا یہ مجموعہ جامعۂ ملیہ علی گڑھ نے اچھے کاغذ پر صاف و خوش خط چھپوا کر شائع کیا ہے۔ شروع میں مولانا کی تصویر اور مختصر حالاتِ زندگی بھی تحریر ہیں۔ قیمت کہیں نہیں لکھی۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے پچاس صفحات پر چھپی ہے اور اس میں مولانا کی قدیم و جدید کوئی ۲۲ غزلیں اور چند قطعے ہیں۔ بجز قطعات کے یہ سب غزلیں وقتاً فوقتاً اُردو اخبارات و رسائل میں طبع ہو چکی ہیں۔

مولانا محمد علی اُردو کے پُرگو اور مشّاق شاعر نہیں ہیں، لیکن اُن کے کلام کا یہی مختصر مجموعہ اس بات کا شاہد ہے کہ اگر وہ شعرگوئی کی طرف توجہ فرماتے تو اُن کی ذکاوت اور تخیل کی بلند پروازی غالباً انھیں اُردو کے بہترین شعرا کا ہم رتبہ بنا دیتی۔

چونکہ یہ غزلیں عام طور پر حال ہی میں طبع ہوتی رہی ہیں اور اُمید ہے کہ اس خوبصورت مختصر مجموعے کو بھی مولانا محمد علی صاحب کے قدرداں احباب ذوق شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ لہذا اس کا نمونہ پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، صرف رسم پوری کرنے کے لئے ایک غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

ہر رنگ میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ   دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

ہے منّتِ اربابِ وفا صبر و توکل   چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ

دشتِ رہِ غربت میں اکیلا تو نہیں تو، بطحا کے مہاجر کا تو نقشِ کفِ پا دیکھ
ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا ہو صدقِ طلب پھر اثرِ آہِ رسا دیکھ
گو تیری دوروزہ، مرا پیماں ہے ازل کا پابندِ جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ

انتخابِ مضامینِ رسالہ جوہر:

جامعۂ ملیہ علی گڑھ میں جوہر کے نام سے ایک قلمی رسالہ شائع ہوتا تھا (اب "جامعہ" کے نام سے باقاعدہ طبع ہونا شروع ہوا ہے) اس قلمی رسالے کے اچھے اچھے مضامین کو محفوظ کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ انھیں ایک مجموعے کی صورت میں چھاپ دیا جائے۔ یہی مجموعہ یا انتخاب مضامین مطبوعہ رسالے کا بھی نہایت عمدہ اشتہار بن گیا ہے۔

یہ مجموعہ ۱۳۸ صفحے پر چھپا ہے۔ کاغذ اور چھپائی معمولی قسم کی ہے۔ شروع میں شیخ جامعہ مولانا محمد علی کی تصویر دی ہے اور انھی سے اس کتاب کا انتساب کیا ہے۔ نثر کے مضامین میں اندلس کی تاریخ، کارل مارکس کی تعلیم اشتراکیت، احوال زندان وغیرہ عنوانات سے بعض بہت دلچسپ اور کارآمد مضمون چھپے ہیں اور آخر میں بعض نظموں اور غزلوں کا بھی انتخاب شامل کردیا ہے۔ کتاب کی قیمت عمہ ہے۔ جامعۂ ملیہ کے مہتمم صاحب مکتبہ، جامعہ سے ملیگی۔

مکاتیبِ اکبر:

یہ مولوی اکبر حسین مرحوم اکبر الہ آبادی کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو مرحوم نے گزشتہ ۱۱، ۱۲ سال کی مدت میں مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کے نام بھیجے تھے۔ انھیں دائرہ ادبیہ لکھنو نے معمولی کاغذ پر صاف چھپوا کر چھوٹی تقطیع کے تقریباً سوا دو سو صفحات پر مجلد شائع کیا ہے اور شروع میں ناظم دائرہ مولوی محبوب علی صاحب نے اکبر کی نظم و نثر پر ایک دیباچہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

مکاتیبِ اکبر، مصنف مرحوم کی پُرنویسی کا ثبوت ہیں۔ لیکن ان میں اور کوئی علمی یا ادبی خصوصیت

ایسی نظر نہیں آتی کہ ہم بھی فاضل دیباچہ نگار کی مفرط ستایش کی ہمنوائی کریں۔ باقی اس میں شک نہیں کہ مولوی اکبر حسین صاحب مرحوم نے اپنے خاص طرزِ کلام کی بدولت نظم اُردو میں ایک خاص مرتبہ حاصل کرلیا ہی اور اس لئے اُن کے خیالات اور حالات کے متعلق جو کچھ بھی قلمبند کرلیا جائے وہ آئندہ تذکرہ نویس کے واسطے فائدے اور دلچسپی سے خالی نہوگا۔

چندن :

یہ چودہ[۱۴] افسانے اور ایک ڈراما ہی جنھیں پنجاب کے قابل انشا پرداز سدرشن صاحب نے لکھا ہی رام کتاب ڈپو، لاہور نے صاف ستھرا چھپوا کر مجلد شائع کیا ہی۔ اس قسم کے مختصر افسانے لکھنے میں منشی پریم چند کو جو کمال حاصل ہی وہ اُردو خواں ناظرین سے مخفی نہیں۔ لیکن زیر نظر مجموعے کو دیکھ کر ہمیں نہایت خوشی ہوئی کہ ہمارے ہاں اس میدان کے اور مرد بھی موجود ہیں۔ کیونکہ انصاف یہ ہی کہ چندن کے بعض افسانے کسی طرح منشی پریم چند کے بہترین افسانوں سے کم رتبہ نہیں ہیں اور بعض جگہ خیالات کی بلندی اور زورِ بیان کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہی کہ اُردو زبان میں کیسی کچھ قوتیں مخفی ہیں۔ تقریباً پونے تین سو صفحے کی کتاب میں صرف چند مقام یا الفاظ ایسے نظر آتے ہیں جو شاید ٹکسالی زبان کے اُستادوں کو کھٹکیں گے ورنہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ کتاب کسی پنجابی مصنف کے زورِ قلم کی یادگار ہی۔ ہم سُدرشن صاحب کو اُن کی ادبی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ علم ادب کی اس صنف کو وہ آیندہ اور زیادہ فروغ دینگے۔

ان دلچسپ افسانوں میں ہمیں ''خانہ داری کا سبق'' اور ''کنول کی بیٹی'' کا قصہ سب سے زیادہ پسند ہی ان میں اخلاقی نکتہ بھی پنہاں ہی۔

بحر المحبّت :-

یہ اردو کے پختہ کار شاعر مصحفی مرحوم کی مثنوی ہی جو اس سے قبل رسالہ اُردو میں شائع ہو چکی ہی۔ فاضل مرتب مولوی عبدالماجد صاحب نے شروع میں ایک مقدمہ مصحفی کی شاعری اور اس مثنوی

کے محاسن پر لکھا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ چونکہ زبان کسی قدر قدیم ہے اور قلمی نسخہ ناقص، اس لئے بکثرت حواشی دیئے ہیں (حواشی وہی ہیں جو اُردو میں چھپے تھے) بعض بے ضرورت بھی ہیں۔ کتاب سلسلۂ آصفیہ کے ذیل میں مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

سائنس

بادل کے بچے:

یہ دلچسپ کتاب پروفیسر فیروزالدین مراد پروفیسر طبعیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے چھوٹے لڑکوں کے واسطے لکھی ہے اور ۱۱۶ صفحے پر خوشخط چھپوا کر شائع کی ہے۔ اس میں بھاپ، بادل، اولے برف وغیرہ بننے کے حالات کو قصّے کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور اس کا ماخذ ایک انگریزی کتاب "رین چل ڈرن" ہے۔ اگرچہ یہ کتاب ترجمہ نہیں مگر کہیں کہیں ترجمہ پن صاف نظر آتا ہے اور ہمارے خیال میں بعض عبارتیں اور بعض حصّوں کا پیرایۂ بیان بھی اتنا آسان اور سلیس نہیں ہے کہ دس بارہ برس کی عمر کا لڑکا بلا دقت سمجھ لے۔ لیکن مجموعی طور پر کتاب بہت اچھی اور قابل قدر ہے اور ہم لائق مؤلف سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ سائنس کے دیگر مسائل پر بھی اسی قسم کی جس قدر زیادہ کتابیں یا رسالے تحریر کرسکیں ضرور لکھ کر شائع کریں۔

کتاب میں چند تصویریں بھی لگائی گئی ہیں، لیکن یہ ایسی اچھی نہیں جیسی کہ انگریزی کتابوں میں ہم دیکھنے کے عادی ہیں اور شاید سنگی مطبع میں یہ ممکن بھی نہیں۔ تاہم ہمیں اُمید ہے کہ قابل پروفیسر اس کتاب کی طبع ثانی نیز اس قسم کی دوسری کتابوں کی اشاعت کے وقت اِن جزوی امور کا ضرور لحاظ کریں گے کہ ان کی سعی زیادہ مقبول و مطبوع ہو۔

نیرنگ ارض (قیمت عہ۴)

جغرافیہ طبعی کے موضوع پر یہ مختصر کتاب سید راحت حسین صاحب بی اے۔ ال ال، بی نے

تالیف کی اور مطبع آگرہ اخبار، نئی بستی آگرہ سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں زمین کی ہیئت، گردش، موسم، کرۂ ہوا، پہاڑ، دریا، سمندر، مد وجزر، وغیرہ کو جدید تحقیقات کے مطابق وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ علمی مسائل جستہ جستہ اُردو کے بعض جغرافیوں اور نصاب کی کتابوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں، لیکن راحت حسین صاحب نے اچھا کیا کہ انھیں ایک مستقل کتاب کی صورت میں جمع کر دیا۔ جدید طبعیات کے مسائل پر اُردو میں کتابیں تالیف کرنے کا قابل مؤلف کو خاص سلیقہ ہے اور ان کی دو تین کتابیں (القمر وغیرہ) پہلے بھی چھپ کر ملک میں قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کی اس تازہ تالیف کی بھی جس کے ایک مضمون پر بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہا نے مولف کو تین سو روپے انعام عطا فرمایا ہے، اُردو خواں حضرات خاطر خواہ قدر کریں گے۔

تاریخ

خلافت موحدین:

(مترجمہ جناب مولوی محمد نعیم الرحمن صاحب ایم اے پروفیسر عربی۔ گورنمنٹ محمدن کالج مدراس)

اندلس کے نامور مورّخ علامہ عبدالواحد نے ۶۲۱ھ میں وہ شہرۂ آفاق تاریخ مرتب کی تھی جس کا نام المعجب فی تلخیص اخبار المغرب" ہے۔ ۱۸۴۷ء میں ڈاکٹر ڈوزی نے یہ کتاب شائع کر دی، اور اب پچھلے سال (۱۹۲۲ء) مولوی نعیم الرحمن صاحب نے "خلافت موحدین" کے نام سے اس کا ترجمہ فرمایا ہے جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے مصنف خاندانِ موحدین کا معاصر ہے، اُس کی تاریخ کا وہ بدیع المثال حصہ جو دولت مصامدہ یا سلطنت موحدین سے مخصوص ہے نہایت اہم ہے اور بیشتر واقعات خود اُس کے مشاہدات پر مبنی ہیں، شعار دولت و نظام حکومت کے تذکرے ہماری عام تاریخوں میں نہیں ملتے مگر اس کتاب میں یہ خصوصیت جا بجا نمایاں نظر آئے گی اُس عہد کا تمدن، اُس زمانہ کی معاشرت، اُن دنوں کی تعلیم اور سلاطین کا علمی انہماک، یہ ایسے خصائص ہیں جو اس تاریخ کی افضلیت پر بہترین شہادت دے سکتے ہیں، حق گوئی اس کی خاص صفت ہے، مصنف جن سلاطین کا دست گرفتہ ہے اُن کی کمزوریاں ظاہر کرنے میں بھی اُسے باک نہیں، مورخین عجم کی طرح وہ بادخوانی

نہیں کرتا۔

بعض تاریخی فوائد خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔

مثلاً ایک روایت مشہور ہے کہ ابن تومرت نے ایک عالم و فاضل بزرگ کو عامی و جاہل کی حیثیت میں رہنے کا حکم دیا اور ایک مخصوص موقع پر اُن کی علمیت نمایاں کرائی جس کا نہایت مفید سیاسی اثر پڑا اور لوگ اس کو ایک کرامت یا خارق عادت سمجھے، یہ روایت بالکل ہی مجروح تھی اور ایک افسانہ کی حیثیت رکھتی تھی، لہذا مصنف نے اس کو بالکل ہی قلم زد کر دیا۔

قوموں کے عروج و زوال کا وہ بہترین راز داں ہے، اُسے معلوم ہے کہ مُرابطین کی سلطنت کس شان و عظمت کی تھی۔ جمہور میں تعلیم کس قدر پھیلی ہوئی تھی، مدنیت میں کیسی کچھ ترقی ہو چکی تھی، با ایں ہمہ یہ قوم مٹ گئی اور اس سلطنت کو زوال آگیا، وہ اس کا سبب محض قوم کی آرام طلبی و تن آسانی بتاتا ہے، جنگی جذبات معدوم ہو چکے تھے، عبدالمومن کا سیلاب آیا تو نہ تعلیم اس طوفان کو روک سکی نہ تہذیب سے بچاؤ ممکن ہوا۔

اندلس کے سب سے بڑے فلسفی ابوبکر بن صائغ کی نسبت ابن خلکان کی رائے اچھی نہیں، اس باب میں ابن خلکان کا ماخذ ثعالبی کی ''یتیمۃ الدہر'' ہے جس نے ابن صائغ کے الحاد کا فتویٰ دیا ہے اور اسی فتوے کی بنا پر فرنگی مستشرقوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فلسفہ کی تعلیم اندلس میں حرام تھی۔ مصنف نے دکھایا ہے کہ ثعالبی کو ذاتی طور پر ابن صائغ سے خصومت تھی، ورنہ اندلس میں رواجِ فلسفہ کا تو یہ عالم تھا کہ خود سلاطین کو بھی اس کا شغف تھا۔

ترجمہ کی نسبت صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ مترجم ایک مستعد فاضل ہیں جن کے روشن ترین علمی مناصب و مدارج کے شاہد وہ حروف مقطعات ہیں جو نام کے ساتھ لوح کتاب پر ثبت ہیں، اُنھوں نے اور اُن کے قابل تعریف خاندان نے تاریخ کی بہت بڑی خدمت کی ہے جس کی قوم شکر گزار ہے۔ ترجمہ میں بعض باتیں محلِّ نظر بھی ہیں:

(۱) فرماتے ہیں ''مسلمانوں نے اندلس کو ۹۲ھ کے ماہ رمضان میں فتح کیا، یہ فتح طارق (اور بہ روایتے ابن زیاد اور بہ قولے ابن عمرو) کے ہاتھوں ہوئی'' (خلافت موحدین صفحہ ۶)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتح اندلس یا تو طارق تھے یا بروایات ضعیفہ ابن زیاد و ابن عمرو۔ لیکن اصل

عبارت یہ ہے۔

"افتتح المسلمون جزیرۃ الاندلس فی شہر رمضان سنہ ۹۲ھ من الھجرۃ وکان فتحہا علی ایدی طارق قیل ابن زیاد وقیل ابن عمرو" یعنی مسلمانوں نے ماہ رمضان سنہ ۹۲ھ میں اندلس کو فتح کیا، یہ فتح طارق کے ہاتھوں ہوئی جن کے والد کی نسبت اختلاف ہے بعض نے زیاد کو اور بعض نے عمرو کو طارق کا والد بتایا ہے۔ (المعجب صفحہ ۶)

۲ "طنجہ اور اندلس کے درمیان وہ خلیج ہے جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں اور جو زقاق کے نام سے مشہور ہے مجازی طور پر یہ سمجھنا چاہیئے کہ موسیٰ بن نصیر امیر قیروان نے اس فتح کو ترتیب دیا۔"

یہ دو علیحدہ علیحدہ فقرے تھے جن کو مترجم نے ایک کر دیا۔ المعجب کی اصل عبارت یوں ہے:

"بینہا (ای بین طنجۃ) وبین الاندلس الخلیج المذکور المعروف بالزقاق وبالمجاز۔ رتبہ موسےٰ بن نصیر امیر القیروان"

مطلب یہ ہے کہ (۱) طنجہ اور اندلس کے درمیان جو خلیج ہے وہ زقاق اور مجاز کے نام سے مشہور ہے (۲) موسیٰ بن نصیر نے فتح اندلس کا سامان کر کے طارق سے یہ کام لیا تھا (۳) ترجمہ کے الفاظ "مجازی طور پر یہ سمجھنا چاہیئے الخ" حقیقت سے بالکل دور ہیں۔

۳۔ "طارق موقع و فرصت کو غنیمت پا کر جزیرہ خضرا کے راستے سے اندلس گئے۔"

المعجب کی اصل عبارت یہ ہے کہ:

"فرکب طارق البحر من جہۃ مجاز الجزیرۃ الخضراء الفرصۃ امکنتہ"

یعنی (۱) طارق سمندر میں جہاز پر بیٹھ کر روانہ ہوگئے (۲) روانگی کی سمت جزیرۂ الخضرا والی وہی خلیج تھی جسے "مجاز" کہتے تھے (۳) یہ سفر جزیرۂ خضرا کے راستے سے نہ تھا بلکہ خلیج مجاز کے راستے سے طے ہوا

۴۔ "بیان کیا جاتا ہے کہ ہشام ان کے قصر میں رہتا تھا، ان کے حشم میں سے ہشام کے لئے خواص مقرر تھے، ہشام ان کے لئے بطور حاجب کے کام کرتا تھا، ان کے احکام کا نفاذ اسی کے سپرد تھا اور وہی ان کے لئے منابر پر دعاؤں کے اجرا کا بندوبست کرتا تھا" [خلافت موحدین صفحہ ۸۲]

اصل عبارت یہ ہے:

"ذکر ان ھشاماً عندہ لقصرہ، وشھد لہ خواصٌّ من حشمہ، وانّہ فی صورۃ الحاجب لہ والمنفذ لامورہ، وامر بالدعاء لہ علی المنابر" (المعجب صفحہ ۶۲)

یعنی (۱) المعتضد فرماں روائے اشبیلیہ نے بیان کیا کہ آخری اموی خلیفہ ہشام میرے پاس میرے ہی قصر میں موجود ہے (۲) خاصانِ حشم و خدم نے اس بیان کے سچ ہونے کی شہادت دی (۳) المعتضد نے یہ بھی ظاہر کیا کہ میں تو خلیفہ ہشام کا صرف حاجب ہوں اور اُن کے احکام کو نافذ کراتا ہوں (۴) المعتضد نے حکم دیا کہ خلیفہ ہشام کے لئے بر سرِ منبر دعا کی جائے، یعنی بجائے معتضد کے ہشام کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔

۵۔ "المعتضد ہر وقت اہل سرحد کی خبر دریافت کرتے تھے کہ آیا بربری مراکش کے میدان میں اُترے ہیں یا نہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک بزرگ سے جو اُن کے پاس رہا کرتا تھا اُن کو یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ قوم اُن سے یا اُن کے بیٹے سے خلع کرائیگی" (خلافت موحدین۔ صفحہ ۹۱)

اصل عبارت یہ ہے:

"کان المعتضد فی کل وقت یستطلع اخبار العدوۃ ھل نزل البربر حبۃ مراکش؟ وذلک لما کان یراہ فی ملحمۃ کانت عندہ ان ھؤلاء القوم خالعوہ او خالعو ولدہ" (المعجب صفحہ)

یعنی (۱) معتضد ہر وقت سمندر پار کے حالات دریافت کیا کرتے تھے کہ میدان مراکش میں آیا قوم بربر نے پڑاؤ ڈال دیا یا ابھی نہیں (۲) بنائے دریافت یہ تھی کہ آئندہ فتنوں کے متعلق معتضد کے پاس پیشین گوئیوں کی ایک کتاب موجود تھی (۳) معتضد نے اس کتاب میں دیکھ لیا تھا کہ یہ لوگ۔ یعنی قوم بربر جو مراکش میں فروکش ہونگے یا تو خود معتضد کو سلطنت سے معزول کر دینگے یا اُس کے لڑکے کی حکومت چھین لیں گے۔ (۴) ملحمہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کوئی بزرگ تھے جو معتضد کے پاس رہا کرتے تھے اور اُنھیں سے معتضد کو یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ فتنہ و ملحمہ کی بیسیوں روایتیں اسلام میں موجود ہیں اور احادیث میں "ملاحم و فتن" کا ایک خاص باب ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح کی اور بھی بہتیری باتیں ہیں، مگر کچھ بھی ہو فاضل مترجم کا ہم صدق دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اُن کے علمی ذوق سے اُردو میں ایک مفید و پاکیزہ کتاب کا اضافہ ہوا جس سے ہم جیسے متعلم کبھی بے نیاز

نہیں ہو سکتے۔

کتاب کا حجم ۳۸۰ صفحے ہے۔ ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت چھ روپیے (۶ـــــ/)

ملنے کا پتہ: مولوی معتضد ولی الرحمٰن ایم اے۔ نصیر کاٹیج۔ ربانی روڈ۔ لاہور

مذہب و اخلاق

کلید مراد: قیمت ۸/

اس مختصر رسالے میں مولانا شفیق عماد پوری نے دعا کے فوائد اور قرآن شریف اور احادیث نبوی کی بعض دعائیں، موقع محل اور ان کے اردو ترجموں کے ساتھ جمع کر دیے ہیں۔ شروع میں خواجہ حسن نظامی کا ایک مختصر دیباچہ ہے۔ آخر میں مناجاتیں اور صوفیہ کے منظوم شجرے درج ہیں۔ کتاب صاف خوش خط چھپی ہے۔ مگر قیمت کسی قدر زیادہ ہے۔

اعظم الاخلاق:

اس کتاب کی تالیف پر سید منظر علی صاحب (خلف مولانا امجد علی صاحب اشہری مرحوم) کو سرکار نظام الملک آصف جاہ کی جانب سے پچاس روپیہ ماہانہ کا تاحیات وظیفہ بطریق انعام مرحمت ہوا ہے۔ اور کتاب شہزادگان بلند اقبال کے اسمائے گرامی سے معنون کی گئی ہے۔ اس کتاب میں لائق مولف نے اخلاق حمیدہ جیسے احسان، سخاوت، استقلال، صبر، تحمل، ادب، تواضع وغیرہ کے ۵۰ عنوان قرار دیے ہیں اور ہر عنوان کے معنی کی صراحت کر کے ذیل میں مختلف ماخذوں سے چند کارآمد اور عمدہ مقولے نقل کیے ہیں۔ ان مقولوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا اور نہ اس کی چنداں ضرورت تھی لیکن ہمارا خیال ہے کہ انھیں زیادہ سلیس اور شگفتہ زبان میں نیز کسی خاص ترتیب کے ساتھ لکھا جاتا تو اُن کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا۔۔ اس قسم کی خشک نصیحتیں لڑکوں لڑکیوں کے لئے اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتیں جب تک اُن میں کوئی

دل چسپی کا سامان پیدا نہ کیا جائے۔

کتاب کی قیمت اور ملنے کا پتا کہیں درج نہیں

اردو کے جدید رسالے

جامعہ :-

یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کا ماہوار علمی رسالہ ہی جو اس سال سے شایع ہونا شروع ہوا ہی۔ اس میں اکثر مضامین طلبۂ جامعہ ملیہ کے ہیں۔ علاوہ شذرات کے چار مضامین نثر کے اور تین نظمیں ہیں پہلا سیاسی انقلابات کا اثر علوم ایران پر، دوسرا سیاست بین الاقوامی پر، تیسرا مسئلہ تاوانِ جنگ پر، چوتھا ہندوستانی تعلیم کا مرکز پر (جو ڈاکٹر ٹیگور کے مضمون کا ترجمہ ہی) ان کے علاوہ جرمنی سے کسی نامہ نگار نے دو مختصر خط لکھے ہیں۔ نظموں میں دو غزلیں ہیں اور ایک نظم رویاے صادقہ پر ہی۔ اگرچہ رسالہ یونیورسٹی کی شان کا نہیں ہی لیکن مضامین مفید اور پر از معلومات ہیں۔ حقیقت میں ایسے مضامین کی ضرورت بھی ہی تاکہ ہمارے اہل وطن موجودہ زمانہ کے حالات اور واقعات اور سیاسی اور معاشی مسائل سے آگاہ رہیں۔ چونکہ اس کے لکھنے والے زیادہ تر طلبہ ہیں، اس لحاظ سے رسالہ قابل تعریف ہی۔ ہمارا مشورہ یہ ہی کہ اس رسالے کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ صاف اور فصیح زبان میں ملک کے اُردو داں طبقے کی خدمت میں اُن تمام مسائل کو پیش کرے جن کا جاننا اس زمانہ میں نہایت ضروری ہی۔ بے خبری بہت بڑا گناہ ہی۔ اس کا رفع کرنا درحقیقت نیکی ہی۔ اگر جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ اس مقصد کو پیش نظر رکھیں تو ملک پر بڑا احسان کریں گے اور تعلیم کے حقیقی منشا کو پورا کریں گے۔

رسالہ کا حجم ۵۶ صفحہ ہی اور چندہ سالانہ چار روپیہ

نظام کالج اُردو میگزین :-

یہ رسالہ اسی سال جاری ہوا ہی۔ اس کے شائع کرنے والے اور لکھنے والے

نظام کالج (حیدرآباد دکن) کے طلبہ ہیں۔ اس کے مقاصد "مقالۂ افتتاحیہ" میں یہ بتلائے گئے ہیں:-

"یہ بغیر کسی تخصیص یا امتیاز کے تمام طلبہ کا سچا رفیق و مشیر اور خیر طلب ہوگا۔ اس میں ایسے مضامین شائع ہونگے جو ادبی ذوق رکھنے والے ناظرین کی تفریح طبع کا باعث ہونگے۔"

کالج کے پچاس سالہ قیام میں یہ پہلا وقت ہے کہ وہاں کے طلبہ نے اس قسم کی ادبی کوشش کی ہے۔ اساتذہ سب الگ ہیں۔ سارا انتظام طلبہ کے ہاتھ میں ہے اور مضامین بھی سب کے سب طلبہ ہی کے معلوم ہوتے ہیں جن میں قدیم اور جدید طلبہ دونوں شریک ہیں۔ مضامین اوسط درجہ کے ہیں جو مستعد اور شوقین طالب علموں کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ مضامین ادبی اور تاریخی ہیں۔ پانچ چھ نظمیں بھی ہیں۔ اگر یہ رسالہ اُردو ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں کوشش کرے تو بڑا کام کرے گا۔ یہ معمولی کام نہیں۔ اس میں بڑی محنت اور تلاش و جستجو کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے نتائج بہت قابل قدر اور بیش بہا ہیں۔ صحیح ذوق سے انسان کے خیالات اور اخلاق پر نہایت اچھا اثر پڑتا ہے اور اس کی زندگی میں بڑا تغیر اور انقلاب پیدا ہوجاتا ہے۔ طلبہ اور عام پڑھے لکھے لوگوں میں صحیح ذوقِ ادب پیدا کرنے کی بہت ضرورت ہے اور اگر یہ رسالہ اس کام کو اپنے ذمہ لے تو کچھ تعجب نہیں کہ اس کی کوشش بار آور ہو اور ملک کے خیالات میں تغیر پیدا کردے۔

ہم نظام کالج کے طلبہ کو اس ادبی تحریک پر مبارک باد دیتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ اسے دکن کا ایک اچھا رسالہ بنانے کی کوشش کریں گے۔

رسالہ کا حجم ۴۰ صفحہ ہے اور سالانہ چندہ چار روپئے آٹھ آنے۔

الناظر:

کچھ دنوں بند رہ کر اب پھر جاری ہوا ہے۔ الناظر کے پرجوش اور مستعد اڈیٹر پر اس زمانے میں جو مصیبتیں نازل ہوئیں اُن سے کم و بیش لوگ واقف ہیں۔ یہ رسالہ انھیں اس قدر عزیز ہے کہ باوجود ان تمام مصائب کے انھوں نے اپنی غیر حاضری میں بھی اسے جاری رکھنے کی کوشش کی، لیکن اس میں کامیابی نہوئی

اب بڑے گھر سے واپس آکر انھوں نے پھر اسے جاری کیا ہے۔ اس کی وہی شان ہے جو پہلے تھی۔ مضامین بھی بالکل اُسی قسم کے ہیں جیسے پہلے ہوتے تھے۔ ''نظرے خوش گزرے'' میں وہی تشدد آمیز شوخی ہے۔ ہم مولوی ظفر الملک علوی کو اس استقلال پر داد دیتے ہیں۔ وہ سب دنیوی علائق چھوڑنے کے لئے آمادہ ہیں مگر الناظر کی محبت اُن کے دل میں ایسی ہے کہ اُسے چھوڑنا کسی طرح گوارا نہیں۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ سوائے کتابوں کے اشتہار کے انھیں یا کسی دوسرے کو کسی قسم کا فائدہ نہیں۔

ظل السلطان :

تین سال بند رہنے کے بعد اس جنوری سے پھر شائع ہوا ہے اور خواتین کی خدمت پر پہلے سے زیادہ آمادہ نظر آتا ہے اور کان پکڑتا ہے کہ آیندہ کبھی ایسی تاخیر اور قصور نہ کرے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جو اُردو کے نئے نئے رسالے نکلے تو مولوی محمد امین صاحب ''زبیری'' کے دل میں بھی امنگ پیدا ہوئی اور اُنھوں نے ظل السلطان کو از سر نو پھر شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ مضامین اور ترتیب کا ڈھنگ وہی ہے جو پہلے تھا۔

حجم ۴۰ صفحہ سالانہ چندہ تین روپیہ چار آنے مقام اشاعت بھوپال۔

ستلج :

یہ رسالہ دسمبر ۲۲ء سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اب تک اس کے دو نمبر ہمارے پاس پہنچے ہیں۔ مقام اشاعت لودیانہ (پنجاب) ہے۔ اڈیٹر نے اس کا مقصد یہ قرار دیا ہے: ''اردو علم ادب کی ترقی اور کامیابی اہلِ ملک کو نئے سے نئے علوم وفنون سے آگاہ کرنا مختلف اصنافِ ادب میں جدّت پیدا کر کے اُردو زبان کو دنیا کی ایک بہترین علمی زبان بنانا''۔ اس کے بعد وہ خود ہی سوال کرتے ہیں کہ دوسرے رسالے بھی تو اپنے مقاصد یہی بیان کرتے ہیں تو ستلج کونسی نئی بات پیدا کرے گا؟ اس کا جواب بھی وہ خود ہی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''اُردو زبان کے دورِ جدید کی ابتدا سے لے کر آج تک کے رسائل وصحائف کو دیکھا جائے، سب

ایک ہی لکیر کے فقیر نظر آئیں گے۔ وہی قلم کی گھس گھس، وہی ادبی "ٹکڑہ"، وہی علمی مضمونچہ"، قصہ نویسی کی طرز بھی تو پارینہ، انشا پردازی کا ڈھنگ ہی تو فرسودہ۔ حصہ نثر میں وہی پامال شدہ مضامین قطعۂ نظم میں وہی قافیہ اور ردیف۔ روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں میں درج ہونے والے مضامین ماہوار رسالوں میں لکھ کر سرے سے ایک باسی اُتار دی جاتی ہے۔ ناظرین کے علمی مذاق کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاتا۔ قارئین کی ذہنی اور دماغی ترقی کی طرف کچھ توجہ نہیں کی جاتی اور نہ ان میں تخیل کا مادّہ پیدا کر کے ان کے رشحات قلم کو بروے کار لایا جاتا ہے لیکن ستلج اگر خدا نے چاہا تو ان قلتوں کو پورا کرے گا۔ نقائص کا ازالہ کرے گا، نیا ڈھنگ اختیار کریگا جدید طرز پہ چلے گا۔ زبانِ اُردو کو ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچانے کے لئے سعی بلیغ کرے گا۔ ادق سے ادق مسائل کو ایک عام فہم زبان میں بیان کرے گا۔ نئے خیالات اور انوکھے جذبات سے تعارف کرائے گا ۔۔ وغیرہ وغیرہ"

دعویٰ بہت بڑا ہے۔ اس کا ایک حصہ بھی پورا ہو جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ ستلج کی روانی زمین ادب کو بہت کچھ سیراب کردے گی۔ اِن دو نمبروں میں اس کے آثار کم نظر آتے ہیں۔ لیکن اس میں خدا شک نہیں کہ رسالہ بہت دلچسپ ہے۔ اس کے قصے انوکھے اور لطیفے پُر لطف ہیں۔ ہونہار نظر آتا ہے اور آگے بڑھنے کا دم خم رکھتا ہے دوسرے نمبر کا پہلا مضمون جس کا عنوان "اقطاعِ عالم میں اُردو بولنے والے" ہے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس مضمون کے پڑھنے سے قبل یہ خیال کرنا ناممکن تھا کہ برسکز، رے ڈیلا ماڈلیں، یوجی (جرمنی مشرقی افریقہ) چلی میں بھی اُردو بولنے والے ملیں گے۔ اسی رسالے کے آخر میں اُردو انسائیکلوپیڈیا کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے۔ روپیہ بہم پہنچانے کی یہ تدبیر سوچی گئی ہے کہ مشترکہ سرمایہ سے ایک کمپنی قائم کی جائے جس کا سرمایہ ایک لاکھ روپیہ ہو جو دس دس روپئے کے دس ہزار حصوں میں منقسم ہو۔ اس سے پہلے بھی اُردو انسائیکلوپیڈیا کے متعلق کئی بار تجویزیں ہوئیں مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس سے بڑھ کر ہمیں کسی بات کی مسرت نہ ہوگی کہ ستلج اس میں کامیاب ہو۔ بعض لطائف، معمات اور مضامین کے لئے انعامات بھی مقرر کئے ہیں۔

افسوس کہ لکھائی چھپائی اچھی نہیں۔ کاغذ بھی ناقص ہے۔ اُمید ہے کہ اولوالعزم اڈیٹر اس کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کریں گے۔

قیمت سالانہ پانچ روپئے (حجم ۸۰ صفحے)

الکمال:

یہ رسالہ نومبر ۱۹۲۲ء سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کا اصل مقصد ملک میں تجارت، صنعت و حرفت کا شوق پھیلانا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی صدری اور مجرب نسخے اور طب، ادب، تاریخ پر مضامین شائع ہوتے ہیں بعض مضمون بہت کارآمد بھی ہوتے ہیں۔ ہماری رائے ہیں اگر وہ اس رسالے کو صنعت و حرفت اور تجارت ہی تک محدود رکھیں تو بہت مناسب ہو۔ یہ میدان کچھ کم وسیع نہیں لیکن جب ان مضامین کے ساتھ ہم غزلیں اور نظمیں بھی دیکھتے ہیں تو یہ چیزیں بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ صنعت و حرفت کے حصے میں بعض مفید و کارآمد اور تجارتی اشیاء کے بنانے کے نسخے بھی درج ہیں۔ اگر اس کا مقصد خاص حد تک محدود کر دیا جائے تو یہ رسالہ ملک کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے۔ اڈیٹر آغا بشیر خاں ریاض شروانی ہیں۔ مقام اشاعت دہلی۔ سالانہ چندہ للعہ طلبہ و مستورات سے علاوہ محصول عہ بڑی تقطیع پر دو کالم میں لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ہے۔

تصویر وفا:

یہ رسالہ بھی حال ہی میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ سرورق پر سب سے اوپر لکھا ہے "ہندوستان بھر کے تمام اُردو رسالوں کا سرتاج ماہوار رسالہ" اس سے نیچے اُتر کر یہ الفاظ نظر آتے ہیں "علمی، ادبی، اخلاقی تواریخی، تمدنی، طبی، ظریفی، روحانی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ" اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے اکثر عنوانوں پر کوئی نہ کوئی مضمون ضرور ہے خواہ وہ کسی حیثیت کا ہو۔ شعر و سخن کی چاشنی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ چھپا اچھا نہیں اور کاغذ چھپائی سے بھی خراب ہے۔ سالانہ چندہ چار روپیہ ہے۔ مقام اشاعت لودیانہ (پ۔ آ)

اردو

۱۔ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ہی جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہی جس میں زبانِ ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔ حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحہ ہوگا۔

۳۔ قیمت نو روپے بارہ آنے سالانہ معہ محصول ڈاک اور ارکانِ انجمن ترقی اردو سے آٹھ روپے بارہ آنے

۴۔ تمام خط و کتابت آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو و اڈیٹر اردو اورنگ آباد سے ہونی چاہیے

(باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔